حسن کی قیمت

اور دوسرے افسانے



احمد شجاع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حسن کی قیمت

اور

دوسرے افسانے

مختصر افسانوں کا ایک دلاویز مجموعہ

مصنفہ

حکیم احمد شجاع۔ بی۔ اے (علیگ)

مصنف ' باپ کا گناہ ' عقد ثریا وغیرہ

سنہ ۱۹۲۲ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

دارالاشاعت پنجاب

۱۹۵ ریلوے روڈ۔ لاہور

بار اول
ایک ہزار

پیشکش

"محبت کا قرض صرف محبت ہی ادا کر سکتی ہے"

میں

اپنے محبت و عقیدت کے اس ناچیز تحفہ کو

اپنے عزیز و محترم دوست

میاں احمد یار خاں صاحب دولتانہ رئیس ملتان

کی خدمت میں

پیش کرتا ہوں

گلے کہ تحفہ بہار است از بہار است

اسد شجاع

فہرست

تقریب

آج کل ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں مختصر افسانے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں۔ اور اس خاص صنف ادب کی ترقی میں ملک کے بہت سے باکمال ادیب اور نامور اہل علم حصہ لے رہے ہیں۔ یہ امر جہاں اس فن کی آیندہ ترقی کی ضمانت ہے۔ وہیں مختصر افسانہ نویسی کی دلکش خصوصیتوں کی دلیل ہے۔

مختصر افسانوں کا مجموعہ نہ تو کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے شائع ہوتا ہے نہ جوارِ ادب میں جگہ تلاش کرنے کے لئے۔ مجھے نہ تو زباندانی کا دعوے ہے نہ ماہر فن ہونے کا وہم۔ ہاں اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اور ایسے قدردانوں کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے نذر ناظرین ہے۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ افسانے دوسرے افسانوں سے اچھے ہیں یا برے مگر شاید مختلف ضرور ہیں۔ بعض باریک بین نقادان فن کو میرا انداز بیان کچھ زیادہ عریاں نظر آئے گا۔ اور بعض اہل زبان حضرات کو میری طرز تحریر میں ایک اجنبیت کا احساس ہوگا مگر میں ان دونوں عیوب کو اپنی افسانہ نگاری کی خصوصیت سمجھتا ہوں۔

اخلاق آموزی کے دو ہی طریق ہیں ایک تو یہ کہ نظر کو بدی کی دلکش جاذبیت سے بچا بچا کر نیکی کے مناظر کو دیکھنے کی طرف راغب کیا جائے اور دوسرے

نہ کہ آنکھ اوروں کے لئے کسی رنگین یا اچھی زندگی کی گہرائیوں کا مطالعہ کرلے سکے
مواقع بہم پہنچائے جائیں میں دوسرے طریق کو زیادہ موزوں، زیادہ موثر
اور زیادہ دلاویز سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے افسانوں کا پڑھنے والا
ان افسانوں کے کیرکٹرز کے ساتھ ایک عارضی زندگی بسر کرے۔ ان کے درد
سے بے قرار ہو۔ اور ان کی مسرت سے مسرور۔ ان کی لذت گناہ گاری سے مخمور
ہو۔ اور ان کے ایک ندامت سے متعلق میں ان جذبات اور حالات کے متعلق ذکر
کر کے جو ان افسانوں کو قلمبند کرنے کے محرک ہوئے ہیں اس راز کو بے نقاب کرنا نہیں چاہتا
جو صنف میں ان کا واحد حسن ہے یقیناً ناظرین کی طبائع اپنے اپنے زاویہ نگاہ اور نکتہ
خیال کے مطابق ان میں معانی تلاش کر لیں گی افسانہ نویس کو نہ تو واعظ کی حیثیت اختیار
کرنی چاہئے نہ فلسفی کی۔ اس کا کام فقط مصوری ہے اور شاعری اگر وہ اپنی خیالی
تصویر کو ناظرین کی آنکھوں کے سامنے لائے اور اپنے جذبات سے پڑھنے والوں کے
دل کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہی افسانہ نویسی کا معراج ہے۔

یہ افسانے ایک نامکمل شکل میں ملک کے مختلف ادبی رسالوں میں چھپ چکے ہیں
اور میں اس پہلے موقع پر ان تمام ذرہ نواز قدردانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے
زبانی اور تحریری تعریفوں سے مجھے ان کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی جرأت دلائی۔
میں نے ان جذبات کو جو دنیا میں رہ کر محسوس کیا ہے رو رو کر لکھا ہے خدا کرے
میری آہ کی سوزش اور میرے آنسوؤں کی کاٹ ان دو مردوں کو بھی بیقرار کرنے میں کامیاب ہو

احمد شجاع

حسن کی قیمت

(۱)

مرزا مسعود ایک خوب صورت انسان تھا۔ خوبصورتی قدرت کا ایک بے بہا عطیہ ہے مگر جو شخص صرف خوب صورتی کو انساں کی سب سے بڑی سفارش سمجھتا ہے اکثر دھوکا کھاتا ہے۔ مسعود کی نوجوان مگر سادہ مزاج بیوی اسی دھوکے میں مبتلا تھی اور اس چیز کو جو اس کے خرمن عقل پر بجلی گرانے والی تھی اپنی سب سے زیادہ قیمتی دولت سمجھتی تھی مسعود کا حُسن اگر کسی عورت میں ہوتا۔ تو لوگ اُسے پری، حور اور نہ معلوم کن کن ناموں سے خطاب کرتے۔ مگر وہ مرد تھا۔ اس کے حسن کی قدر محض عورت کر سکتی تھی عورتوں کو ہندوستان میں مرد کا حسن دیکھنے اور اس کی قدر کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اس لئے حسن آئینہ ہیں اس نے اسے حسن کو سب سے پہلے دیکھا وہ اس کی بیوی تھی جس زبان سے اس نے اپنے حسن کی تعریف سب سے پہلے سنی وہ اس کی بیوی کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز تھی۔ مگر آہ یہ سب کچھ اس وقت ہو جب اس

سکے حسن کی قدر کرنے والی عورت اس کی بیوی بن چکی تھی۔ بیوی بننے کے بعد عورت اپنی دلچسپی اپنی قیمت۔ اپنی اہمیت کھو دیتی ہے وہ مرد کی ملک بن جاتی ہے۔ جو جس وقت اور جس حالت میں چاہے اُسے دیکھ سکتا ہے اس میں وہ سحر آلود کشش نہیں رہتی جو صرف ان چیزوں میں ہوتی ہے جو حاصل نہیں ہو سکتیں یا جن کے حاصل کرنے کے لئے کوشش کی ضرورت ہوا کرتی ہے مرد ایک ایسی عورت میں جو اس کی بیوی نہ ہو اپنے تقاضات شوق اپنے جذبات مجنوں سے مجبور ہو کر ہر روز ہر ساعت نئے نئے حسن تلاش کرتا ہے اس کے حصول کے لئے اپنی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرتا ہے۔ اس کی ذرا سی توجہ اس کی ایک نظر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اپنے جسم و روح کی تمام ممکنات کو ظاہر کرتا ہے مگر شادی کے بعد عورت خود مرد کی خواہشمند ہوتی ہے یہ اس کی دلبری کی موت ہے وہ جس قدر اچھی بیوی ہو جس قدر اپنے شوہر کی مرضی کی غلام ہو اسی قدر کم دلکش ہوتی جاتی ہے یہ صحبت مستقل عورت کے ہر حسن کو چھین لیتی ہے۔ جو مزے وصل کے بعد فراق میں اور تکمیلِ آرزو کے بعد حسرت و شوق میں ہوا کرتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں ہر نیا دن ایک گزرے ہوئے دن کی نقل ہو جاتا ہے ہر نئی گفتگو ایک سُنی ہوئی داستان سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔

ان ہی خیالات سے متاثر ہو کر مسعود اپنی بیوی کو دیکھنے دیکھتے تھک

گیا تھا وہ اس عورت سے جو اس سے ایک بُت کے پجاری کی طرح محبت
کرتی تھی۔ دور بھاگا جا رہا تھا۔ . محبت کی سرمستی میں ہی ایک زہر
ہے۔ محبت کے گلستاں میں بھی ایک خار ہے۔ محبت کی ہر سحر زندگی میں
ہی ایک موت ہے کہ جس شخص سے محبت کی جائے۔ اس کی نظر میں محبت
کرنے والے کی ہر امید نگاہ میں ایک جنون مجسم۔ اس کی تمنائے محبت ایک بے
معنی التجا اس کی دیوانگیِ شوق ایک بے لطف ضد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔
"سمن" مسعود کی بیوی کا نام تھا۔ ان تمام صفتوں سے بے خبر دن
رات مسعود کو اپنے تخیل کی پرواز کا مقصد اپنے جذبات کی عقیدت کا مرکز
اپنی روح کی عبادت کا معبد بنائے رکھتی۔ اس کی آنکھیں فقط ایک ہی نظارے
کے لئے بیتاب رہتیں اور وہ مسعود کا چہرہ تھا اس کا دل صرف ایک ہی کاوش
سے ہیجان میں رہتا اور وہ مسعود کی محبت تھی۔ وہ ایک مبہوت انسان کی طرح
جس کے قویٰ ذہنی ماؤف ہوگئے ہوں اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مسعود
کو دیکھتی رہتی۔ اس کا جسم اور اس کی تمام خواہشیں اس کی رُوح اور اس کی
تمام آرزوئیں صرف ایک حسرت میں منجمد ہوگئی تھیں اور وہ یہ تھی کہ مسعود
ہر وقت اس کے سامنے بیٹھا رہے مگر مسعود اس کی اس خواہش کو کسی اہم
کام کی مجبوری کے بہانے سے کسی ضروری فرض کی ادائگی کے عذر سے
ٹال دیتا اس وقت سمن کا جنون سکون ایک اضطراب دیوانگی میں بدل

سے لے سازا اسی دوستی کے لحاظ لطف کو ایک سرکیف مسرت میں گزار دیے۔
کاش کہ یوسف آج بھی وہی یوسف ہوتا جو کالج کے زمانے میں تھا جب اس کے خیال کی رفعت دل کی پاکیزگی آنکھ کی عصمت فرشتوں کی سی تھی۔ مگر تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اس دنیا میں داخل ہوا جس میں لوگ صرف کتابیں نہیں پڑھتے۔ اس کی مزاج کی خوبی طبیعت کی نیکی عادات کی سنگی کی وجہ سے ہر قسم کے لوگ اس سے ملے۔ ان میں اچھے بھی تھے برے بھی خدا انسان کو بری صحبت سے بچائے۔ یہ بری بلا ہوتی ہے۔ مہلک سے مہلک زہر میں وہ اثر نہیں ہوتا جو ایک برے ہم جلیس کی باتوں میں ہو سکتا ہے ایک برا دوست برے خیالات کو محض الفاقی ضرورتوں سے ظاہر کرتا ہے یہ خیالات میٹھے زہر کی طرح سننے والوں کی رگ و پے میں سرایت کرتے ہیں ان کے دماغوں میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور پھر ایک غیر معلوم طریق سے جسم و روح میں جذب ہو کر وف فعلیہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔
یوسف کے ساتھ بھی یہی ہوا اس کو کچھ دوست ایسے ملے جو صرف مادی فلسفے کے قائل تھے نفسانی جذبات کی تکمیل کو ہی مآل زندگی سمجھتے تھے اور اکتساب لذات کو جسم کا سب سے اہم فعل تحصیل مسرت کو دماغ کا سب سے بڑا ارتقا حسیات سفلی کی تربیت کو انسان کا سب سے بڑا مقصد تصور کرتے تھے انھوں نے کچھ کتابیں یوسف کو پڑھنے کے لئے دیں ایک جاہل بدکار دنیا کے لئے

اس قدر مصر نہیں ہوتا جس قدر ایک پڑھا لکھا مذہبی شخص ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی قابلیتوں کی بدولت بدی میں جو سامان پیدا کرتا ہے۔ اپنی علمی لیاقتوں سے گناہ کو ایک سرسحر حسن سے آراستہ کرتا ہے اپنی منطقی دلیلوں سے دماغ پر حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے غلط فلسفے کی رو میں انسانی عقل۔ اور روحانی نیکیوں کو بہالے جاتا ہے ان کتابوں نے یوسف کے دماغ کو مسحور کر دیا یوسف کے قوی کو ایک ہی مقصد کی طرف منعطف کر دیا اور وہ یہ تھا کہ وہ جوانی کو جس کی بہار انسانی زندگی کے چمن کو صرف ایک ہی دفعہ کھلاتی ہے صرف جوانی کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے وقف کر دے۔

مذہب۔ جو یوسف کے خیال میں صرف اس لئے اختراع کیا گیا تھا کہ انسان کو قدرت کی نعمتوں سے محروم کر دے۔ اور گناہ کو جو ایک نوجوان زندگی کی سب سے بڑی ترقی ہے۔ ڈراونا اور مہیب بنا دے اب یوسف کے لئے ایک بے معنی لفظ ہو گیا۔ ضمیر کو اس نے انسانی کمزوری کا ایک دوسرا نام سمجھا۔ نیکی کو محض لطائف زندگی کے حصول کی قابلیت کی عدم موجودگی تصور کیا اور نیک انسانوں کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ کیونکہ وہ محض اس لئے کہ جوانی کی لذتوں سے خود لطف اٹھانے کی قابلیت نہیں رکھتے دنیا کو ان پرکیف نعمتوں سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

اب کیا تھا مناسب اور غیر مناسب کی تمیز جاتی رہی کسی چیز کے جائز

پانا جائز ہونے کا کوئی معیار ہی نہ رہا۔ یوسف نفسانی جذبات کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی بن گیا۔ جو آسائش اس کی ذاتی وجاہت اور دولت خرید سکتی تھی حاصل کی گئیں۔ محبت صرف عارضی خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بنائی گئی عورت اب اس کے خیال میں اس کھلونے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی جو پرانا ہو جانے کے بعد ٹوٹ جانے کے بعد یا اسی نہ بدل سکنے والی ہیئت سے جی اکتا جانے کے بعد محض پھینک دینے کے لئے خرید لیا جاتا ہے۔

اس یوسف کو مسعود نے اپنی بیماری کا طبیب سمجھا۔ اس یوسف سے مسعود نے اپنی منکوحہ بیوی کے تعلقات کے متعلق مشورہ لینے کا ارادہ کیا۔ اس یوسف کے ناپاک فلسفہ سے مسعود نے اس پاک رشتہ کی گتھی کو سلجھانا چاہا۔ آہ! دنیا میں کیسی مصیبتیں ہیں جن میں صرف نتائج کی لاعلمی سے انسان اپنی زندگی کو مبتلا کر لیتا ہے کتنے اہم اور دردناک نتائج ہیں جن کی بنا محض بے خبری، نادانی اور کوتاہ عقلی سے انسان اپنے ہاتھوں سے رکھ دیتا ہے کتنی زندگیاں ہیں جو محض ایک سمجھدار مشیر ایک صادق دوست۔ ایک ہمدرد انسان کے میسر نہ آنے سے برباد ہو جاتی ہیں۔

یوسف نے چائے کی پیالی کو بائیں ہاتھ میں لے کر اور دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے سگریٹ کی راکھ کو گراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”مسعود تم اپنے آپ کو نہیں جانتے تم نہیں جان سکتے قدرت نے تم کو

اپنی سب سے بڑی نعمت سے اپنی انتہائی فیاضی کو کام میں لاکر مالا مال کردیا ہے
تم نے اس نعمت کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آؤ میری آنکھوں کی مدد سے
اسے دیکھو۔"

اب یوسف کی آواز زیادہ بلند زیادہ زوردار اور زیادہ مدلل ہو رہی تھی۔
"یہ نعمت تمہارا لازوال حسن ہے۔ تمہاری لاثانی جوانی ہے آہ تم اس کو ابھی دیکھ نہیں سکتے۔ سمجھ نہیں سکتے ایک دن جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے جب ان روشن آنکھوں کی جگہ مرجھائی ہوئی بے نور آنکھیں۔ ان لالوں کو شرمانے والے گالوں کی جگہ جھری دار بے رنگ، لٹکتے ہوئے گال ہوں گے۔ جب ایک بے لطف زندگی کی یاد ایک داغ ناتمام کی حسرت، تمہارے چہرے کی خوب صورت سطح پر اپنے سیاہ اور گہرے نقش چھوڑ جائیگی۔ جب اور صرف جب ہی تم اس ایک دفعہ کھو جانے کے بعد کبھی ہاتھ نہ آنے والی دولت کی حقیقت سمجھو گے سونے چاندی کے سکے دنیا کی بہت سی آسائشوں کو خرید سکتے ہیں مگر جن عجیب مسرتوں کو تمہاری جوانی خرید سکتی ہے کوئی دولت کوئی نعمت نہیں خرید سکتی۔ زندگی کیا ہے صرف جوانی کا ایک عام فہم نام ہے۔ کیا بچوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ کیا بوڑھے انسان بھی زندہ کہلانے کے مستحق ہیں ہرگز نہیں صرف جوانی کا زمانہ جو صرف ایک بار آتا ہے جو انسان کی حیات کو صرف ایک خاص وقت کے لئے منور کرتا ہے۔ زندگی کا زمانہ ہے رات

کے تاریک اور تھا تک سالوں کو جو دن کی رس جوس صورتی کو چھپا لیتے ہیں
زائل کرنے کے لئے سورج پھر نکل آتا ہے۔ خزاں رسیدہ ستوں، مرجھائے ہوئے
درختوں کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے بہار پھر آجاتی ہے مگر آہ بڑھاپے کے
ہاتھوں برباد شدہ حسن کو تروتازہ کرنے کے لئے جوانی پھر نہیں آتی۔ تم حسن کے
بادشاہ ہو ایک مغرور بادشاہ کی طرح حکومت کرو۔ تمہارا حسن قدرت کا سب
سے قیمتی سکہ ہے اسے چلاؤ تمہارا حسن ایک زندہ طاقت ہے اس کا خراج
عورتوں کی آنکھوں سے وصول کرو"۔

اب یوسف چائے ختم کر چکا تھا اس نے سگریٹ کو کسی اندرونی
جوش سے مشتعل ہو کر پھینک دیا اور کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ مسعود
ایک پرحیرت سکوت میں تھا مگر اس کے دل و دماغ ان خیالات کی آندھی
سے اس طرح چکر میں تھے جس طرح کسی عجیب طوفان کے گرداب میں
مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرے ایک غیر متناہی چکر میں آجاتے ہیں یوسف
یک لخت مسعود کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں
کو مسعود کے کندھوں پر رکھ کر اپنے سر کو آگے کی طرف جھکا کر اپنی آنکھوں کے
پورے زور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

"تمہاری بیوی تم سے کیوں محبت کرتی ہے۔ مجھے بتاؤ وہ کیوں تم کو کسی
وقت اپنے پہلو سے جدا کرنا نہیں چاہتی صرف اس لئے کہ تم حسین ہو محض

اس لئے کہ تمہارا یہ لازوال حسن صرف اس کی ملکیت بنا ہے وہ تمہارے حسن کی پرستش کر کے تم پر احسان نہیں کرتی وہ صرف اُس کی قیمت ادا کر رہی ہے۔ بیسویں صدی میں ہر مسرت کی ایک قیمت ہے تمہارے حسن کا ایک نظارہ دلوں کو ایک ابدی مسرت سے معمور کر دیتا ہے اس کی جو قیمت ادا کی جائے تھوڑی ہے۔ صرف ایک عورت کی محبت یقیناً اس حسن کی، اس جوانی کی کافی قیمت نہیں ہے"

پھر یوسف نے ٹہلنا شروع کیا۔ اور مسعود کو سوچنے کے لئے کچھ موقع ملا۔ اس وقت مسعود کا دماغ صرف یوسف کی لہر سے زہر کو ایک مدہوش شرابی کی طرح پی رہا تھا اور ہر قسم کی حرکت سے نا آشنا معلوم ہوتا تھا۔ مسعود کے دماغ میں یوسف کے فقرے ایک تحریرِ آتشیں کی طرح نقش ہو گئے۔ اس نے سمجھ لیا کہ "شیریں" اس کی پیار کرنے والی بیوی اس سے محض اس لئے محبت کرتی ہے کہ وہ حسین ہے۔ خوش اندام ہے اور جوانی کی دولت سے مالا مال۔

اتنے میں یوسف یک لخت رکا اور گویا کسی بڑے خیال کی تحریک سے اس کا دماغ تڑپ اٹھا ہے۔ اس نے فوراً مسعود کے بازو میں اپنا بازو ڈال کر ایک چالاکانہ انداز سے کہا۔

"آؤ میں تم کو حسن کے بازار میں لے چلوں۔ جہاں حسن کو پرکھا جاتا ہے

جہاں حسن کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ جہاں حسن کو صرف سب سے بڑی قیمت ادا کرنے والا ہی خرید سکتا ہے۔ وہ ایک نئی دنیا ہے۔ اس کی سیر کرو۔ اس کے سربستہ رازوں کو دریافت کرو۔ اپنے حسن اپنی جوانی کی قدر کرنے والوں کو دیکھو۔ اور جو تم کو سب سے زیادہ قیمت دے جو تم کو اپنے حسن و جوانی کے سرور سے مدہوش کردے اس کو اس مسرت مخمور کے پیالے میں ا۔ نہ۔ اور جس اپنی بے بہا جوانی کی دولت کو لوٹنے دو کہ یہ صرف اسی کا حق ہے۔"

یوسف نے زیادہ تر اپنے بازو کے زور سے مسعود کو اٹھایا مسعود نے ایک متحرک بت کی طرح اپنی ٹوپی سر پر رکھی۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور یوسف کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس کی پُرسحر شخصیت سے مسحور ہو کر اپنے مکان کے دروازے سے نکل گیا

(۲)

یوسف، مسعود کو ساتھ لئے، شہر کی گنجان گزرگاہوں اور تنگ و تاریکیوں کی بھول بھلیوں میں سے نکلتا ہوا ایک تاریک مگر فراخ بازار میں جا پہنچا۔ یہ ایک عجیب بازار تھا۔ ایک طرف شہر کی مغربی فصیل جس کے پرہیبت سائے دور تک پھیلے ہوئے تھے، زمانہ ماضی کی خاکستر میں کفن پوش،

زبان خاموشی سے اپنی عظمت مرحوم کی داستان سنا رہی تھی۔ دوسری طرف ان عہدِ سابق کے سیاہ دامن میں ایک وسیع سڑک جا رہی تھی جس کے دونوں کناروں پر قریباً ایک ہی وضع کے مکانوں کی ایک لمبی بسیط ہموار قطار بستیاً ایک نئی آبادی کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔

فصیل کے دروازے سے داخل ہو کر یوسف تک یکسر ٹھہر گیا اور پھر اس نے مسعود کو جو یوسف کے پاؤں کی حرکت کو یک لخت مسدود ہوتے محسوس کر کے اس سے کوئی دو قدم کے فاصلے پر جب جا رہا تھا مگر اپنی آنکھوں میں ایک زندہ علامتِ استفہام کو منتقل کر کے مڑ گیا تھا۔ ایک غائر نظر سے دیکھنا شروع کیا چند لمحوں کے بعد اس نے ایک اضطراری کیفیت سے اپنی لکڑی کے ایک سرے سے اس بازار کی کھلی فضا کی طرف اشارہ کر کے اور پھر اس اضطرار کو ارادتاً ایک نمایاں سنجیدگی میں تبدیل کر کے کہا۔

"مسعود ادھر دیکھو یہ حسن کا بازار ہے کس قدر تاریک کس قدر خاموش، کس قدر غیر آباد معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ منظر ایک روشن ایک زندہ ایک خوب صورت تصویر کی پیک گراؤنڈ ہے۔ چاند رات کی تاریکی میں ہی چمکتا ہے۔ پھول جنگل کی تنہائی میں ہی بہار دکھاتا ہے۔ حسن گناہ کی تیرگی میں ہی نظر آ سکتا ہے۔"

مسعود اسی طرح دم بخود تھا ایک ذرا سے وقفے کے بعد جس میں ساجد یوسف نے ایک پراسرار گہری اور حسرت سے بھری ہوئی نظر سے اس بازار کا سرسری سا مطالعہ کر لیا اُس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس خوب صورت ساحرہ کا مکان ہے جس کے حسن کی قیمت نہ گرانی کا انتظار کرکے غلہ بیچنے والے ذمہ داروں اور دو صاحب منصب غریبوں کا خون پینے والے سود خوار ساہوکاروں کی دولت ادا نہیں کر سکی۔

اس کا نام بہار ہے کس قدر خوب صورت نام ہے مگر جس کا یہ نام ہے وہ اس نام سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

مسعود اپنی آنکھوں کو یوسف کی تیز نگاہوں سے ہٹا کر اس مکان کی طرف دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ یوسف نے اپنی لکڑی کو بائیں ہاتھ میں سنبھال کر دائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زبان کسی کتاب کو جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے پڑھ رہی ہے وہ اس وقت تک نہ رُکا جب تک اس نے اپنی تقریر کو تمام نہ کر لیا۔

"اس مکان کے ساتھ کا مکان اس فتنہ روزگار کا ہے جس نے سب سے پہلے مجھ پر اس حقیقت کو روشن کیا کہ حسن، شعر، موسیقی۔

پھول۔ سانپ اور عورت ایک ہی جنس کے کئی نام ہیں یہ ایک زندہ صنعت تضاد ہے۔ پڑھنا لکھنا مطلق نہیں جانتی مگر فطرتاً فلسفی مزاج ہے سگریٹ بہت پیتی ہے اسی لئے مجھے سب سے زیادہ پسند ہے میری زندگی کے دو مکمل سال اس کو سمجھنے میں صرف ہوئے اب میں اس سے تھک گیا ہوں صرف اس وقت جب میں سگریٹ پینے سے لطف حاصل کرنا چاہتا ہوں وہاں جاتا ہوں۔ مگر سنو نہایت عمدہ نرکی سگریٹوں کا بکس اپنے ساتھ لے جاتا ہوں جسنا یہ اس کا نام ہے۔ عمدہ ترکی سگریٹوں کے سوا اور کوئی سگریٹ پسند نہیں کرتی ہم دونوں اس کمرے میں جس کی کھڑکی اس گلی کے کھمبے کے قریب نظر آرہی ہے۔ بڑے اطمینان اور آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے مسلسل اور بے آواز بادلوں سے اپنے درمیان ایک لطیف حجاب حائل کئے ہوئے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ ادھر دیکھو اس سامنے کے مکان میں ایک اور نازنین رہتی ہے یہ کشمیر میں پیدا ہوئی مگر اس نے پرورش ہندوستان میں پائی اس لئے اس میں کشمیر کا حسن کشمیر کی صباحت کشمیر کی تروتازگی ہے لیکن مت گھبراؤ۔ اس کی عادتیں اس کی خصلتیں سب ایک ہندوستانی عورت کی سی ہیں۔

میں سال تک ایک شریف زادے کے گھر میں اس کی بیاہتا بیوی

کی سمت سے رہی ہے اس لئے کبھی کبھی محض اس سرلیت گھر کی یاد
تازہ رکھنے کے لئے، اس عارضی زندگی کو دہرانے کے لئے اپنے ہاتھ
سے کھانا پکاتی ہے اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتی ہے اپنے ہاتھ سے
گھر میں جھاڑو دیتی ہے وہ سب کونے میں جو ذرا اونچا سا مکان نظر
آتا ہے اس میں ایک ملائکت فریب بہت ہی کم سن حسن فروش رہتی
ہے وہ جس قدر کم سن ہے اسی قدر سوخ اور سمجھ دار ہے اپنے آپ
کو بہت ہی نیک بڑی پارسا ظاہر کرتی ہے کبھی تم نے اسٹیج پر نقلی
بالوں، نقلی لباسوں سے آراستہ ایکٹروں کو دیکھا ہے۔ بس اسی طرح
یہ ان نقلی صفات سے آراستہ ہوکر دولت مند امیرزادوں کو بے وقوف
بناتی ہے ہر ایک سے عارضی محبت کی شکایت کرتی ہے۔ ہر ایک
سے شادی کرنے پر رضا مند ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کبھی نہ پورے
ہونے والے وعدے سے اپنے شیدائیوں کا دل بہلا کر ان کی عقیدت
سے خراج تحسین حاصل کرکے ایک عجیب شان تمسخر سے مسکراتی ہے
مجھ سے بہت گھبراتی ہے۔ کیونکہ میں کبھی اس سے شادی کرنے پر رضامند
نہیں ہوا اس کو وہ اپنی عقل کی شکست سمجھتی ہے اور ایک کمزور مفتوح
کی طرح اپنے زبردست دشمن کی خوبیوں میں برائیاں تلاش کرتی ہے۔ کہتی
ہے" تم فطرتاً ایک برے آدمی ہو۔ تم ایک عورت کو گناہ کے سبب سے

سے آزاد کرنا نہیں چاہیئے" میں صرف یہی کہہ کر چپ ہو جاتا ہوں" صرف اس لئے کہ میں اپنے آپ کو ایک عورت کے پیچھے میں گرفتار کرنا نہیں چاہتا۔"

وہ دیکھتے ہو وہ سفید سا مکان وہ جس کے سامنے ایک بیل کا درخت ہے یہ یار کا مکان ہے۔"

یوسف نے ذرا جھک کر مسعود کے کان میں کسی کا نام لیا جس سے مسعود کے چہرے میں ایک نمایاں تغیر نظر آیا اس کی کھلی ہوئی آنکھیں اور کھل گئیں۔ "تم کو جانتے ہو کتنا پارسا شخص ہے کس قدر مشہور ہے کس قدر مغرور مگر اس وقت وہ تم کو اسی مکان میں ملیگا ہر روز قریباً نصف شب گزرنے کے بعد دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپ کر آتا ہے صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس چلا جاتا ہے اور شہر کی سب سے بڑی مسجد میں جا کر صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہے اس کو علم نہیں کہ میں نے اسے کئی مرتبہ اس مکان میں دیکھا ہے۔ اگر مجھ سے آج کل کے نوجوانوں کی بدکاریوں کی شکایت کرتا ہے ایک نیک زندگی کے اچھے نتائج کو اپنی زندہ مثال سے ظاہر کرتا ہے۔ اور ایک عجب انداز سے اپنی آواز کو ضرورت سے زیادہ بلند کر کے اپنے ہر ایک لفظ پر غیر معمولی زور دیتے ہوئے کہتا ہے" یہ ہے ایک بڑی طاقت ہے، اسی طاقت کے اعتماد پر انسان شیطان کی تحریص و ترغیب کا مقابلہ کر سکتا ہے گو یہ ہے کہ

اصول کسی نیک انسان کے اعمال کی تقلید کے بغیر اپنی خوبیاں ذہن نشین نہیں کر سکتے آج کل ایسے لوگوں کی کمی ہے اور جو تھوڑے بہت ہیں وہ مری طرح منظر عام پر آیا پسند نہیں کرتے۔ کاش کہ تم لوگ میری صحبت سے فائدہ اٹھا سکو۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مذہب کی طاقت اور اس نیک انسان کے اعمال کی تقلید کی کامیابی پر ہنستا ہوں

ور اس مکان کو دیکھا جس کا چھجہ کچھ آگے کو بڑھا ہوا ہے اس میں ایک عجب عورت رہتی ہے۔ اس کا رنگ مغربی عورتوں کی طرح سفید اور بال بالکل سنہری ہیں مگر نقش و نگار راجپوتانے کی عورتوں کی طرح بہت تیکھے ہیں۔ بہت حسن ہے مگر مجھے کچھ زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے میں سفید رنگ کو پسند نہیں کرتا اگر اس کا رنگ ذرا سانولا ہوتا اور بال اس قدر سنہری نہ ہوتے تو یقیناً میں ابھی عمر کے چند سال اس کی قربان گاہِ ناز پر بھینٹ چڑھا دیتا اس کو انگریزی اور پارسی وضع کے لباس سے بہت رغبت ہے اور حقیقت میں یہ لباس اس کے بدن پر بہت کھِلتے ہیں اس کو انگریزی زبان میں گفتگو کرنے کا شوق ہے۔ اس زبان کے جس قدر الفاظ اس نے یاد کئے ہیں ان سب کو ایک ہی فقرے میں استعمال کر دیتی ہے ہندوستانی وضع سے اس کو نفرت ہے۔ اس کے گھر میں تمہیں چاندنی اور گاؤ تکیوں کی جگہ صوفے اور کرسیاں ملیں گی۔ پان کی جگہ سگریٹ سے تواضع ہو گی ہاں

جوٹ یاد آیا۔ اسے اپنا ہندوستانی نام بھی پسند نہیں کسی نے اس کا انگریزی
ترجمہ اسے سنا دیا ہے اسی سے پکارا جانا پسند کر لی ہے وہاں جاؤ گے
تو میں برل کے سوا اسے کسی نام سے مخاطب نہ کرنا۔ وہ اپنے سب کے سوا اور اس
کے متعلق بھی میں کچھ زیادہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا اسے خیالات، عادات اور
مذاق کے لحاظ سے بالکل مغربی ہے چلو آؤ سب سے پہلے اسی کے ہاں
چلیں تم خود مغربیت کے دلدادہ ہو تمہیں یقیناً بہت پسند آئے گی۔
اور اس میں تو ذرا شک نہیں کہ وہ تم کو بہت پسند کرے گی"

یہ کہہ کر یوسف نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور مسعود کے ہاتھوں کے
سامنے لا کر اسے کھول دیا مسعود نے ذرا سے انداز تکلف سے ایک
سگریٹ لیا۔ پھر یوسف نے اس میں سے سگریٹ لے کر اور سگریٹ کیس
کو بند کر کے جیب میں رکھا دیا سلائی جلائی اور پہلے مسعود کے سامنے
پیش کر کے پھر اپنے سگریٹ کو جلا کر اسے جیب میں ڈال لیا اور چلا۔
مسعود بھی سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر گردن کو ایک عجیب بے بسی کی
شان سے آگے کی طرف جھکا کر اور اپنی لکڑی کے مڑے ہوئے سرے
سے کندھے پر زور دے کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا مگر ابھی مشکل سے
کوئی دس قدم ہی چلا ہو گا کہ اس نے یوسف کو ایک دوسروں سے ذرا
غیر مانوس وضع کے مکان کے سامنے آکر رکتے دیکھا یوسف ظاہراً طور پر کچھ

سوچ رہا تھا۔ پھر خود بخود ہی اُس نے کچھ فیصلہ کر کے، مسعود کے بانہں بازوں میں بازو ڈال کر اور اپنی رفتار کو اس مکان کی سیڑھیوں کی طرف جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمیں پہلے یہاں آؤ۔ اس عورت کو دیکھو یہ ایک عورت لڑکی ہے جو افلاس کے مہلک واروں کو اپنے حسن کی ڈھال پر روک رہی ہے اگر اس کے پاس دولت ہوتی تو اس کا مکان سب مکانوں سے زیادہ آباد نظر آتا۔ دولت کی سند کے بغیر حسن کو بھی کوئی نہیں پوچھتا یہ عجب زمانہ ہے ہر چیز کا حسن نمائش پر منحصر ہے اور نمائش کے لئے تم جانتے ہو دولت کی ضرورت ہے"۔

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں کے پہلے زینہ پر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نے سیڑھیوں پر سے کسی کے اترنے کی آہٹ سنی۔ یہ آہٹ سنتے ہی وہ اسی طرح مسعود کے بازوں میں بازو ڈالے ہوئے ایک نہایت ہی سبک خاموش اور پوری حرکت سے ایک کواڑ کی آڑ میں جو باہر کی طرف کھلا تھا چھپ گیا ایک شخص جس کے چہرے کی زردی اس تاریکی میں بھی نظر آرہی تھی سیڑھیوں سے اترا وہ دیکھنے کو تو اتنا عمر رسیدہ معلوم نہ ہوتا تھا مگر اس کی گھبرائی ہوئی نظر، جھکی ہوئی کمر، اور ضرورت سے زیادہ سست اور کمزور رفتار ایک قبل از وقت بڑھاپے کے جانکاہ اثرات کا پتہ دے رہی تھی وہ آہستہ آہستہ محل کے دروازے کی طرف چل دیا جب وہ نظر سے



اس آڑ سے باہر آیا اور پھر اپنے منہ کو مسعود کے کانوں
کے ... اپنی گہری آواز کو ایک پراسرار انداز سے اور گہرا کر کے
کہا "مسعود تم نے پہچانا یہ کون تھا؟" مسعود نے اپنی تمام ذہنی قوتوں کو
اسی تنہائی کی ایک شکل میں مرکوز کر کے اپنے حافظہ پر زور دیا اور اس
کوشش کی ناکامی کو صرف ایک "نہیں" کی شکل میں ظاہر کر کے پھر سے
خاموشی، حیرت، اور استعجاب سے یوسف کی تشریح کا انتظار کرنے لگا۔
یوسف نے ذرا پرے ہٹ کر مگر اسی راز دارانہ عمیق آواز سے کہنا شروع
کیا "اگر میں اس کو آج پہلی مرتبہ دیکھتا تو میں کبھی نہ پہچان سکتا مگر میں
اس کو قریباً قریباً ہر روز دیکھتا ہوں، یہ تمہارا پرانا ہم جماعت جمیل تھا" مسعود
اس نام کو سن کر چونکا اور اس شخص کی شکل کو جسے اس نے ابھی ابھی دیکھا تھا
کسی دوسری تصویر سے جو اس کے دماغ میں محفوظ تھی مطابق کرنے
کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پوچھا "جمیل؟ کون جمیل؟" یوسف نے
بڑے اطمینان سے جس میں ایک زندہ مسرت مضمر تھا کہا "وہی شریر، خوبصورت،
سرمست جمیل جو تمہارے ساتھ ہاکی کھیلتا تھا" یہ سنتے ہی مسعود کی آنکھیں
حیرت سے کھل گئیں۔ اس نے اسی متحرک خون کو اپنے چہرے کی رگوں
میں رکتے ہوئے محسوس کیا اور پھر گویا اسے دیرینہ رفیق کو دوبارہ دیکھنے
اور اس کی شخصیت کے متعلق ایک عجیب شوق مہیا کرنے کی غرض سے اس

بے فیصل کی تاریک فضا پر نظر ڈالی مگر اس کو ایک دھندلے سائے کے سوا جو فیصل کی سردہ پوش وسعت میں گم ہو رہا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

یوسف نے مسعود کی اس بے حسی سے غیر مطمئن ہو کر ایک تسلی آمیز لہجے میں سلسلۂ گفتگو کو جاری کیا" مسعود میں نہ کہتا تھا لوگوں کو گناہ کرنا نہیں آتا۔ جمیل اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کبھی قابلِ رشک صحت رکھتا تھا۔ ہم کو یاد ہے گولف کھیلنے کے مقابلہ میں سب سے اول رہا کرتا تھا دن بھر سوائے ورزش کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ واشنگٹن ہال کے سپرنٹنڈنٹ کو اس کے معدے سے بہت شکایت تھی۔ کتنا نیک چلن اور خوش کردار تھا۔ مگر اسی بیکی کو بدی ایک خاموش دعوت معاملہ سمجھتی ہے آخر گناہ کے مہیب پنجوں میں گرفتار ہو گیا۔ اور پھر اس نے اسی انہماک اسی محویت اسی ذوق سے جس کے لئے اس کو اس کی صحت مند زندگی تیار کر چکی تھی۔ اس سنہری وادی کی پُر فریب گہرائیوں میں اترنا شروع کر دیا شراب نے اس کے معدے اور جگر کو سرطان کی طرح کھوکھلی کر دیا ہے۔ کوکین نے زہریلے گھن کی طرح اس کے گوشت اس کے خون اس کے کل نظام ترکیبی کو چاٹ لیا ہے اس کے باپ کی جمع کی ہوئی دولت اسی بازار میں بکھر کر برباد ہو گئی ہے اب اس کے لئے ان عالیشان اور چمکیلے مکانوں کے دروازے بند ہیں۔ ایک بزدلے ہوس کار کی طرح محض اپنی عادت کو

پورا کرنے کے لئے اس غریب لڑکی کے ہاں آتا ہے اور پھر اپنا غم غلط کرنے کے لئے اس یاد کو مٹانے کے لئے جو اس بازار کی گلیاں جس میں اس نے اپنی صحت اپنی جوانی اپنی دولت کو کھویا ہے اس کے دماغ میں تازہ کر دیتی ہیں، اسے افلاس اسے اختلاط سے بیزار ہو کر جو اس کو مکمل ہوس سے محروم رکھتے ہیں اسی طرح گردن جھکائے، اسی طرح مایوس و مجبور مضمحل کے باہر ایک تکیہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اب وہ اس تکیہ میں جا کر چرس کے روح سوز شعلوں سے اپنے مرتعش قوی کو ایک عارضی زندگی سے مشتعل کرے گا اس کی بہت جلدی فنا ہونے والی زندگی اس خارجی حرارت سے سنبھالا لے گی اور وہ اس سرورِ مستعار سے مطمئن ہو کر چند لمحوں کے لئے وہیں، اسی گندی اور متعفن زمین پر بے ہوش ہو جائے گا" مسعود کا چہرہ اس لیکچر کا ایک ایک فقرہ ایک جملہ ایک ایک لفظ سن کر متغیر ہو رہا تھا یوسف سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پھر اس اثر کو اور موثر بنانے کے لئے نہایت دردانگیز، نہایت عمیق نہایت مفصل طریقہ سے اس ہولناک داستان عبرت کو سنا رہا تھا مسعود آخری جملہ سنتے ہی کانپ اٹھا اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اس کا سر آگے کی طرف کو جھک گیا اور اس نے اپنی لکڑی کو زمین پر ٹیک کر اور اس پر اپنے دونوں ہاتھوں کا پورا زور دے کر اپنی ٹانگوں میں ایک استواری

پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یوسف نے اس ہیجان کا ایک ماہرِ نفسیات کی نظر سے مطالعہ کر کے فوراً ہی کہا "مگر مسعود یہ سب صرف جسم کا قصور ہے جس نے تقاضائے جسمانی کی سب سے بڑی عشرت کو ایک مہیب بدی بنا دیا۔ جس نے اپنے حواس کے مطالبہ کو عقل کی حکمرانی سے آزاد کر کے اعتدال سے ناآشنا کر دیا جس نے خواہشات نفسانی سے روح کی بیماریوں کا علاج نہ کیا۔ اور روح کی لذتوں کو گناہ کی خوفناک ہوسکاریوں میں تبدیل کر دیا تم مت ڈرو۔ مت گھبراؤ۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ آؤ آؤ تم اب تک معصوم ہو بدی کا مقابلہ کرو اور نیک بننے کی کوشش کرو نیکی یقیناً معصومیت سے اچھی چیز ہے۔"
مسعود نے اکھڑے اکھڑے الفاظ میں اسی سراری کو منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی زبان میں ایک مدہوش سرشار کی لکنت تھی، اس کی نظر میں ایک ڈرے ہوئے بچے کا سہم تھا اس کے بدن میں ایک کمزور بیمار کا رعشہ تھا "نہیں یوسف . . میں نہیں جاؤں گا . چلو جلدی چلو میرا دل گھبرا رہا ہے میں گھر جاؤنگا۔"

یوسف نے مسعود کے کندھے پر اپنے دائیں ہاتھ سے ایک حوصلہ افزا تھپکی دے کر اسے مطمئن کرنا چاہا "مسعود یہ گھبراہٹ صرف ایک نئے تجربہ کی پہلی منزل ہے، ایک نئی دریافت کی تمہید ہے نہیں یاد

ہے جب ہم نے پہلے ہی ریاضی کے ایک سوال کو حل کرنے کی کوشش شروع کی تھی۔ ہم کس قدر گھبرا رہے تھے، ہم کو ناکامیابی کا کتنا ڈر تھا لیکن اس کا سوال کوئی گناہ نہ تھا ہر تغیر کی ابتدا اسی گھبراہٹ اسی عدم یقین اسی خوف نتائج سے ہوتی ہے۔ جو شخص ایک ہی رائے پر قائم اور ایک ہی اصول پر کاربند رہتا ہے مردہ ہے زندگی تبدیلی کا دوسرا نام ہے ہر نیا تجربہ ہر نیا علم انسان کی اندرونی کیفیات میں ایک تغیر پیدا کر دیتا ہے اور ہر ایسے تغیر کے بعد ایک نئی حیات کا آغاز ہوتا ہے نافہم انسان تغیر سے ڈرتے ہیں موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں ایک نئے تجربہ ایک نئے علم ایک نئے دور حیات کے دروازے کھلے ہیں۔ آؤ ان میں داخل ہو اور اپنے مرتے ہوئے ذہن کو ایک نئی زندگی سے معمور کردو" مسعود نے اسے وقت فیصلہ کو نزع کے عالم میں دیکھ کر اس کو سہارا دینے کی ایک اضطراری کوشش کی" یوسف! یوسف!! میری عقل کو پامال نہ کرو۔ حمل کی حالت دیکھ کر کون اس زہریلے تجربہ کو دوبارہ آزمائیگا"

یوسف نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور ابھی اس قہقہے کی گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے ہنستے ہنستے کہا" مسعود کتنے لوگوں نے امریکہ کو دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا سب کی ناکامی کولمبس کی شہرت اور کامیابی کے لئے ایک پیغام اجل نہ ہوئی اگر وہ بھی تمہاری طرح صرف

دوسروں کے تجربوں سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے تجربوں سے صرف بے ہمت لوگ سبق سیکھتے ہیں تجربہ صرف ناکامیابی کا ایک معزز نام ہے ہر نئے تجربے کے لئے ایک ہمت کی ضرورت ہے اور خصوصاً اس تجربے کے لئے جس میں بہت سے انسان ناکامیاب ہو چکے ہوں اس صدی کی سب سے بڑی کمی یہی ہے لوگوں کو دریافت کا تحقیق کا شوق ہے مگر آرمائش کی جلتی ہوئی بھٹی میں کودپڑنے کا حوصلہ نہیں۔ یہ بالکل عامیانہ خیال ہے۔ صرف ایک عام رائے کی علامانہ نقلید ہے۔ نفسیات کی عقل کو اس سے زیادہ آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے" مسعود نے ایک بے بس پرندے کی طرح جو ایک نظر فریب جال کے پھندوں میں پھنس کر محصور ہو جاتا ہے اپنی عقل کو یوسف کی وسعت حوصلہ کے سپرد کر دیا اور صرف یہ کہا مگر "یوسف میں ڈرتا ہوں" یوسف نے فوراً بات کاٹ کر جواب دیا "بھی ڈر مسعود تم کو بہادر بنا دے گا" یہ کہہ کر اور پھر اسی طرح مسعود کے بازو میں بازو ڈال کر یوسف اس مکان کی تاریک اور تنگ سیڑھیوں پر چڑھ گیا

(۱۳)

یوسف اور مسعود اس مکان کی اوپر کی منزل پر پہنچ گئے یوسف

سامنے کے کمرے میں جو ذرا سا صحن چھوڑ کر سا منا گیا تھا ایک بے تکلف واقعہ کے انداز سے بغیر کسی کی اجازت طلب کئے داخل ہو گیا۔ مسعود بھی اس نے جگر جا لعروس کی طرح جو کوئی مرتبہ دیکھ کر اپنی فضائے مُبرم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ایک غیر معمولی ہمت' ایک غیر معمولی سکون و اطمنان سے یوسف کے قدم بقدم چلتا گیا۔ اور اس کمرے کی دہلیز پر آکر رک گیا آج مسعود نے اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ ایک بازاری عورت کے مکان کے اندر قدم رکھا تھا اس لئے اس خطرے کو جس سے وہ آج تک ڈرتا رہا تھا اس قدر قریب پاکر اس کی تمام قوتیں جن کو اس نے بڑی مشکل سے مجتمع رکھا تھا منتشر ہو گئیں وہ کچھ مبہوت سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ نہ سمجھ سکا۔ یوسف نے مسعود کی اس کیفیت ذہنی کو سمجھ کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ ساتھ لے جا کر ایک کونے میں ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بٹھا دیا۔

یہ ایک نہایت ہی بدوضع کمرہ تھا جس کی آرائش بہت بدتمیزی سے کی گئی تھی مختلف سامان آرائش جو بہت ٹوٹا پھوٹا اور ایک ناقابل برداشت گندگی سے منہدم تھا اس بے ترتیبی سے رکھا تھا جس طرح ایک بڈھا لبساطی اپنے کئی دفعہ نیلام شدہ سامان تجارت کو بغرض فروخت

سجا سجا کر رکھتا ہے دیواروں پر رنگ دار کاغذ کے بدہیت پھول جن پر کی چھپی ہوئی تہایت ہی سستی اور رنگ دار تصویریں نہایت بھدے طریق سے ذرا سا فاصلہ چھوڑ کے بعد ایک مسلسل قطار میں لگی اور لوہے کے بد نما کیلوں سے جکڑی ہوئی تھیں۔ فرش پر ایک میلی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی جا نماز بچھی تھی جس پر پاؤں سے گرے ہوئے حولے اور کیچڑ کے بے شمار داغ تھے دونوں گاؤ تکیے جو چاندنی سے زیادہ میلے تھے اور جن کے غلاف سر کے تیل کے سیاہی نما دھبوں سے چکنے ہو رہے تھے اودھر اودھر پڑے تھے۔ ایک تانبے کا پان دان جو ظاہرا طور پر بہت ورپسے قلعی کا سرمندہ احسان نہ ہوا تھا بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب کھلا رکھا تھا تام چینی کا ایک بہت بڑا اگال دان صفائی اور پاکیزگی سے بے نیاز پان دان کے قریب پڑا تھا۔

یوسف اور مسعود کے پاؤں کی آہٹ سن کر ایک کوٹھڑی کے اندر سے جو اس کمرے کے دائیں طرف واقع تھی ایک باریک مگر کسی قدر دلکش آواز سنائی دی "کون صاحب ہیں" یوسف نے تکیے پر لیٹے لیٹے اپنا چہرہ اس کوٹھڑی کی طرف کرتے ہوئے کہا "ذرا باہر تو آیئے" کوئی ایک سٹ کے بعد ایک کم سن، سانولے رنگ کی لڑکی

اپنی رنگ دار ململ کی ساڑھی کا آنچل سنبھالتے ہوئے کوٹھری سے باہر نکلی اور بڑی بے تکلفی کے انداز سے "آہا یوسف صاحب ہیں! کہئے آج آپ کہاں بھول پڑے" کہتی ہوئی یوسف کے قریب آکر دھم سے بیٹھ گئی۔ مسعود نے ایک جبر عورت کو اس سال بے حجابی سے اس قدر قریب دیکھ کر کسی فطری تقاضے سے آنکھیں نیچی کر لیں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اس دھڑکن کو ایک بلند آواز گھڑی کی مسلسل اور ہموار رفتار کی ضربوں کی طرح اپنے دماغ میں محسوس کیا۔ اس کو اپنے ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں ابھری ہوئی دکھائی دیں۔ اس کا چہرہ دوران خون کی ایک اضطراری رو سے تمتما اٹھا۔ اور اس کو اپنے تمام بدن پر بخار کی سی کپکپی طاری ہوتے نظر آئی۔

اس بے حجاب بے نقاب حسن فروش کے آنے ہی وہ بدوضع اور بدنما کمرہ کچھ خوبصورت سا معلوم ہونے لگا۔ اس کی ساڑھی کا رنگ ضرور شوخ تھا مگر وہ خود اس کیفیت بیم عریانی میں سادگی کا ایک مجسم بت تھی۔ اس کے لمبے اور سیاہ بال جو چوٹی پر سے دو حصوں میں تقسیم کئے گئے تھے اس کے کندھوں کے سامنے کھلے ہوئے پڑے تھے۔ اور ہوا کے جھونکوں سے مضطرب ہو کر اس کے دامن میں مچل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں رسیلی، شرمیلی، اور سرمے سے زہر آلود تھیں۔ اس کا

ٹھہرا ٹھہرا ہوا نہ تھا مگر اس میں وہ ملاحت، وہ کمزوری وہ سکون کی سی کیفیت تھی جو ایک خوب صورت عورت کو بیماری کی حالت میں اور زیادہ حسن بنا دیتی ہے۔ یوسف نے اس کے سوال کا صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس خاموشی سے مطمئن نہ ہو کر اور شاید اپنی گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے اس نے مسعود کی طرف اپنی لمبی اور نازک انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے یوسف سے سوال کیا "آپ کی تعریف" یوسف نے پہلے مسعود کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھوں کو اس کی طرف پھراتے ہوئے کہا "یہ میرے دوست ہیں بہت عزیز دوست۔ تم سے ملنے کے بہت مشتاق تھے اسی لیے میں انہیں یہاں لایا ہوں" مسعود نے اپنی پیشانی پر شکن ڈال کر یوسف کی طرف دیکھا اور اس سراپا غلط بیان کے جھوٹ کو سمجھنے کی ناکام کوشش کی ——— یوسف کا چہرہ ایک بے گناہ معصوم کی طرح ہر قسم کے ہر انفعال سے آزاد تھا ——— اس فقرے نے خدا جانے اس عورت کے دل پر کیا اثر کیا کہ اس کے بے رنگ چہرے میں سرخی کی ایک نمایاں جھلک دکھائی دی اس کی عمیق آنکھوں میں ایک ڈوبنے والے ستارے کی چمک بے قرار ہوئی اس کے پژمردہ لبوں پر ایک بہار تبسم کھلتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنے سر کو ذرا اوپر کی طرف جنبش دے کر جس سے اس کے بائیں طرف کے بالوں کی لٹوں میں ایک لمحہ بھر کے لیے طلاطم سا برپا

ہوگیا، آنکھوں کی پتلیوں کو بائیں کونے کی طرف متحرک کرتے ہوئے کہا " یہ اور مجھ سے ملنے کے مشتاق! بھلا میں اتنی خوش نصیب کب تھی" اس فقرے کے الفاظ میں ایک اعتراف کم مائیگی، ایک انکسار، احساس ایک اقبال جرم جھلک رہا تھا مگر جس لہجہ میں یہ الفاظ ادا کیے گئے تھے، جس اندرونی کیفیت سے یہ لہجہ متاثر تھا اس میں ایک غرور نسائیت، ایک احساس فتح ایک اور برتری کی لرزش مضمر تھی۔ اور پھر کسی جواب کا انتظار کرنے کے بعد اس نے خود بخود کو یا اس جملہ کو مکمل کرنے کی کوشش کی " ایسے خوب صورت، دولت مند، نوجوان، مجھ سی غریب، بدصورت اور بد نام عورت کے گھر میں کیوں آنے لگے۔ ان کے لئے بہت سے شان دار اور چمکیلے مکانوں کے دروازے کھلے ہیں" ان الفاظ کو اس نے ذراسی ہچکچاہٹ اور بہت زیادہ تکلف کے ساتھ ختم کیا مگر اب اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہوگیا اس کی گردن ذرا نیچے کو جھک گئی۔

مسعود اس منظر کو دیکھنے کے لئے تیار نہ تھا اس کو پہلے تو یوسف کی پیشگوئی کی صداقت کا احساس ہوا۔ جو اس نے اس کے مکان پر جانے سے پہلے کی تھی اور اس حسن کے بازار میں پہلی ہی دکان پر اپنے حسن و شباب کا اعتراف سن کر اور ان کو خریدنے کے لئے ایک عورت کو اپنے حسن و شباب کی کم مائیگی محسوس کرتے دیکھ کر اس کا دل ایک عجیب غرور

سے لبریز ہوگیا۔ مگر سب ایک عورت کو صرف اس لئے کہ اس کے پاس حسن کی سفارش کے لئے سوائے چاندی کے چند ٹکڑے نہ تھے اس کی مست عمر میں سرمندہ و نادم دیکھا تو اس کا سرلف خون جوش مارنے لگا اس نے اپنے دل کو پگھلتے ہوئے محسوس کیا اس نئے جذبے کو وہ محبت کے نام سے تو تعبیر نہیں کرسکتا تھا ہاں اتنا اس نے ضرور دیکھا کہ اس کا دل رحم، رعب اور ایک غیر معلوم مناسبت کے مرکب لطیف کی ایک جاذب کشش سے اس انسانی جذبات سے کھیلنے والی، اس محبت و وفا کے بت بنا بنا کے توڑنے والی، اس اعتماد و اعتبار کو دھوکا دینے والی بازاری عورت کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ اس نے اپنی ہمدردی کے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو جھپک جھپک کر، اپنے دل کو ایثار اور قربانی کی طاقت سے مضبوط کرکے عمر بھر میں پہلی دفعہ ایک غیر عورت کو خطاب کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"آپ جیسی حسین عورت کو دولت کی سفارش کی احتیاج نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگ جو آپ کی قدر صرف اس لئے نہیں کرتے کہ آپ دولت مند نہیں ہیں آپ کی صحبت، آپ کی محبت، آپ کی توجہ کے قابل نہیں آپ کو اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہیئے کہ آپ ایسے نااہل اور ناقدر شناس لوگوں کی نظر بد سے محفوظ ہیں" ان فقروں کو جو بہت آہستہ آہستہ بہت سوچ

سمجھ کر اس انداز سے کیے گئے تھے جس انداز سے ایک فلسفے کا پروفیسر
مسعود کو فلسفہ حیات کے باریک سے باریک نکات سمجھایا کرتا تھا وہ مایوس و
محروم لڑکی ایک محویت سے سن رہی تھی اس کو توقع نہ تھی کہ مسعود اپنی تقریر
کو اس قدر جلد ختم کر دے گا۔ اس لئے وہ آخری جملہ کے اختتام کے بعد
بھی کچھ مضطر سی رہی مگر جب اس نے مسعود کو اس بڑی ذہنی کوشش
کے بعد کچھ تھک کر بالکل خاموش ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس دھندلی
سی روشنی، اس کمی اعتماد، اس تشنگی تحقیق کو اپنی آنکھوں میں مستقل کر کے
جو ایک نئی دریافت کو سمجھنے کے لئے ایک محقق کے دل میں پیدا ہوتی ہے
پوچھا" تو کیا سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے کیا آپ کی جنس کی فطرت میں
اس قدر اختلاف ہے کیا کوئی مرد ایک عورت سے صرف اس لئے کہ وہ اس
سے محبت کرتی ہے محبت کر سکتا ہے" مسعود نے بغیر سوچے سمجھے ایک
اضطراری کیفیت سے جواب دیا" کیوں نہیں کر سکتا یہی تو عورت کا سب سے
بڑا احسان ہے یہی وہ دولت ہے جس سے ایک عورت ایک مرد کو مالا مال
کر سکتی ہے، یہی وہ نعمت ہے جو مرد کو صرف ایک عورت کے ہاتھوں سے
ہی میسر آسکتی ہے" مسعود کہنے کو تو یہ کہہ گیا مگر جوں ہی کہ وہ
خاموش ہوا۔ اور اس نے ان الفاظ کے معانی پر غور کرنا شروع کیا اس
کی آنکھوں کے سامنے اس کی پیار کرنے والی، اس کی محبت میں دیوانی

بیوی کی تصویر آگئی۔ کیا یہ سب کچھ جو اس نے کہا تھا سچ تھا کیا ان بڑے دعاوی کا دعوے دار خود ہی اس بیان کے کذب کا زندہ ثبوت نہ تھا کہ مسعود خود ہی ایک عورت کی محبت کا سب سے بڑا مجرم نہ تھا کیا اگر وہ صرف ایک عورت کی محبت سے بھٹک کر ایک بڑے اعتماد سے غداری کرنے، اس جنس سے تنگ آکر جس کو وہ عورت کا سب سے بڑا حسن کہہ رہا تھا۔ اپنی محبت کو جو ایک محبت کرنے والی بیوی کا واحد حق تھا دوسری عورتوں کے حسن و شباب پر قربان کرنے کے لئے نہیں آیا تھا کیا اس کم سن مگر بہت سے مردوں کی زندگیوں کی رازدار لڑکی نے مردوں کی فطرت کے اختلاف کے متعلق جو شک ظاہر کیا تھا بجا اور درست نہ تھا یہ خیالات تھے جو مسعود کے دماغ میں ایک محشر خیز طوفان برپا کر رہے تھے۔ اور اس کی بھولی بھالی نسرین کی تصویر تھی جو اس کے عالم خیال میں ایک مادی پیکر کی صورت میں، شکووں سے لبریز آنکھوں، امیدوں سے کھلے ہوئے آغوش اور حسرت سے جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اس کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

مسعود لمحہ بھر کے لئے کل موجودات سے بے خبر ہو گیا مسعود کے ان مختصر جملوں نے اس عورت کو جو مسعود کے اندرونی ہیجان سے بے خبر اس کے حساس دل پر ایک معصومیت مسیحا کے خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملہ آور ہو رہی تھی ایک امید سے لبریز مسرت سے معمور کر دیا

وہ اسی جگہ سے اٹھی اور مسعود کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ مسعود کو اس کی اس وقت خبر ہوئی جب اس حسن بازاری عورت نے اپنی دونوں باہیں خود کے گلے میں ڈال کر اپنی منتظر نگاہوں سے مسعود کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "تو کیا آپ مجھ سے محبت کریں گے؟"

یوسف ساید اس عورت کی زبان سے محبت کا نام سن کر یا اس کو اس محبت کی ابتدائی منزلیں طے کرتے دیکھ کر نا جانے کس وجہ سے اٹھا اور ان کی طرف پشت کرکے دیواروں پر چپکی ہوئی تصویروں کو جن میں بظاہر طور پر کوئی قابل مطالعہ خصوصیت نہ تھی۔ ایک ماہر صناع کی نظر سے گھور دیکھنے لگا۔ مگر اس سے پیشتر کہ مسعود کوئی جواب دے اس نے اسی طرح تصویروں پر نظر گاڑے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "دو گلبار! مسعود پر اعتبار کرنا بے سود۔ ایک ہی جیسے بنے ہیں۔" مسعود اور گلبار نے اب پہلی مرتبہ یوسف کی زبان سے ایک دوسرے کا نام سنا دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا مسعود گلبار کو اس شرم سے بیگانہ، اس حیا سے ناآشنا اس نسوانی خودداری سے بے بہرہ حالت میں دیکھ کر پھر کسی سوچ میں پڑ گیا اور دل ہی دل میں اس کے خیال پر غور کرنے لگا۔ "یقیناً میری بیوی اس عورت سے زیادہ خوبصورت ہے مگر اس میں بے باک اظہار حسن نہیں، یقیناً وہ مجھ سے محبت کرتی

ہے مگر اس کی حیا اس کی خودداری محبت کو جدا نہیں کر سکتی، وہ میری بیوی ہے اس کا حسن اس کی محبت میری ملکیت ہے مگر گلنار کے حسن، گلنار کی محبت کو صرف میری محبت ہی خرید سکتی ہے۔"

اس فیصلہ پر پہنچتے ہی اس نے گلنار کے بازوؤں کو آہستہ آہستہ الگ کرتے ہوئے اور پھر ان بازوؤں کو اپنے ہاتھوں سے دبا کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "اگر تمہارے حسن کی قیمت صرف میری محبت ہے تو میں اسے ادا کروں گا۔" گلنار نے ہی ایک فوری حرکت سے مسعود کے سینے سے ہم آغوش ہو گئی۔ اور یوسف نے اسی طرح تصویروں کو دیکھ دیکھ ایک بلند قہقہہ لگایا جس کی گونج ایک استہزائیہ سراں بن کر ہوا کے ذرّوں میں مل گئی۔ پھر اس نے یک لخت مڑ کر اور مسعود اور گلنار کے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے ایک فیصلہ کن مگر تھیٹر کے ایکٹروں کے سے لہجہ میں کہا "معزز شائقین آج کا کھیل 'آغازِ محبت' ختم ہوا کل 'انجامِ محبت' کا کھیل مع ایک دلکش نقل کے دکھایا جائیگا۔ امید ہے کہ شائقین تشریف لا کر کمپنی کی عزت افزائی فرمائیں گے۔"

مسعود یوسف کی اس عجیب تبدیلی روش سے بہت بے چین ہوا اور پھر اس کو صرف ایک معمہ سمجھ کر اور دل ہی دل میں اس کی غلط کاری کو معاف کر کے اس نے ذرا سی دیر اور ٹھہرنے کے لئے کہا۔ مگر یوسف نے اس

درخواست کے جواب میں فقط اتنا ہی کہا "کیوں مسعود میں نہ کہتا تھا۔ تمہارا ڈر تم کو بہادر بنا دے گا مگر یہ اصول جنگ کی واقفیت کے بغیر یہ تیری بہادری بھی کام نہ آئے گی" اور پھر اسی طرح جس طرح مسعود کو لایا تھا اس کے بازو میں بازو ڈال کر اور اس کی طرف سے خود ہی معذرت کر کے "امید ہے گلنار تم معاف کر دو گی۔ اب دیر ہوئی ہے ہم کل پھر آئینگے" اس کو سیڑھیوں کے دروازے کی طرف لے چلا۔ مسعود نے صرف اپنے سر کو پھیرا کر گلنار کی طرف دیکھا گلنار کی آنکھیں جن میں اس کی حسرت نامراد دو رکے ہوئے نہ بہہ سکنے والے آنسوؤں کا ایک حجاب رقص بن گئی تھی مسعود کے چہرے کو صاف صاف نہ دیکھ سکیں مگر مسعود ان امنڈ آنے والے بادلوں کو دیکھ کر جو گلنار کی کھلی ہوئی آنکھوں کی اندرونی فضا میں جمع ہو رہے تھے سرشار ہو گیا اور ایک تسلی آمیز آواز میں جو اس کے اعماق قلب سے نکلتی ہوئی معلوم دی "میں کل آؤں گا ضرور آؤنگا" کہتے ہوئے یوسف کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں سے اتر گیا۔

(۴)

دوسرے دن ابھی چار بھی نہ بجنے پائے تھے کہ مسعود کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ اور ایک نمایاں بے صبری سے یوسف کا انتظار کرنے

لگا۔ وہ بہت دیر تک اسی پائیں باغ کی روشوں پر ٹہلا کیا اور پھر باد
ہوا کی نرم ریز لطافت سے، پھولوں کی دل آویز مہک سے بوجھا گیے
کے لئے جو اس کے سر آرزو عمل کو گدگدا کر اس لئے جذبۂ ہوس پرستی کو آہستہ
آہستہ جگاکر اس سطر میں اس شخصیت کی کمی محسوس کرا رہی تھی جس کے بعد
ہر قسم روحانیت سے عاری ہے۔ برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔
ان چار چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کا فاصلہ جس کو وہ آج سے پہلے صرف ایک ہی
جست میں طے کر لیا کرتا تھا اس وقت کچھ ایسا طویل ہو گیا کہ ختم ہونے کو
ہی نہ آتا تھا وہ سیڑھیوں پر رکھے ہوئے گملوں کے پودوں کو ایک
خاموشی کی دقیق نگاہ سے دیکھتا ہوا بام کے نوک دار اور کھلے ہوئے
پتوں کو اسی انگلی سے چھیڑتا ہوا برآمدے کی اونچی سطح پر پہنچا اور پھر
ایک لمبی سانس کو سا کیئے ہوئے لبوں سے روک کر اور اپنے داہنے ہاتھ
اور گردن کو ایک جھٹکا سا دے کر نگاہوں کو فرش زمین پر گاڑے اپنے
خوبصورت ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔
آج پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ ایک دوست کی صحبت بھی اس
قدر اہم ہو سکتی ہے اور ایک انسان کی زندگی ایک دوسرے انسان کی
معمولیت کے بغیر ایک نامکمل چیز ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس وقت
اپنے کسی خیال کو ایک عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہے اس کے دماغ

میں خیالات کا ایک سیلاب تھا جو باہر نکلنے کے لیے ایک راستہ ڈھونڈھ رہا تھا اس کے دل میں جذبات کا ایک محشر تھا جو ایک سننے والے کان کی تلاش میں قیامت برپا کئے ہوئے تھا۔ اب وہ یوسف کا انتظار پہلے سے زیادہ بے تابی سے کرنے لگا مگر یہ انتظار کا وقت، وقت کی صفاتی خصوصیات سے عاری ہو گیا تھا۔ وہ کبھی اٹھتا کبھی ٹہلتا اور کبھی پھر بیٹھ جاتا اس نے اس کمرے کے بچھے ہوئے ہر کرسی غرض ہر قسم کی نشست پر باری باری بیٹھ کر آخر کار اس حقیقت کو دریافت کیا کہ ان میں سے کسی نشست میں بھی جسم کو آرام دینے کی وہ خاصیت نہیں جو ان کے ایجاد کرنے والوں کے دعووں کی تصدیق کر سکیں۔ اس نے ایک کرب ایک لے جانی سے اس وقت کو یاد کیا جب وہ کھردرے پتھروں کے ایک ناہموار ڈھیر پر یا برآمدہ لکڑی کے ایک غیر سطح انداز پر بیٹھ کر بھی وہ آرام حاصل کر سکتا تھا جو اب اس کو ان گدیلے صوفوں اور گدے دار کرسیوں پر میسر نہ تھا۔

گھنٹے گزر گئے مگر یوسف نہیں آیا۔ اس کی طرف سے کوئی پیغام معذرت بھی نہ آیا۔ مسعود نے یوسف کی اس بے اصول روی سے بیزار ہو کر آخر کار ملازم کو چائے لانے کے لئے کہا وہ چائے ٹھیک چار بجے پینے کا عادی تھا اور اب یہ دو گھنٹے کی تاخیر اس کی کمزور اور حساس رگوں میں ایک ایسے شخص کی سی الجھن پیدا کر رہی تھی جو کسی نشے کا عادی ہو اس اضطراب

میں جب کہ اس کی نگاہوں میں بہت سی چیزیں اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آرہی تھیں اس نے یہ بھی محسوس کیا۔ کہ عادت خواہ کیسی ہی معصوم ہے کی ہو بُری حسرت اور پھر اس کے دماغ نے ہر ایک اصول کی پابندی کو معیوب سمجھنے کے لئے دلائل پیش کرنے شروع کر دیئے کیونکہ عادت حقیقت میں اسی اصول کی پابندی کا ایک مادی اظہار ہے۔

وہ دیکھنے والوں کی نظروں میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا مگر اس کا دماغ اس خوب صورت کمرے سے بہت دور عملی طور پر نے سارہ حالی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ ایک نئی زندگی جس کے سحر دروازے اس کی کسی کوشش کے بغیر شاہدار لفافے دماغی کے ناقابل فہم گوشوں سے کھل چکے تھے۔ اس کے احساسات کو ایک سرار سان آرزو کی طرف کھینچ رہے تھے نئے تجربوں نئے مشاہدوں کی ایک نئی دنیا اپنے آپ کو ایک راز اور لطف نہاں سے چھپائے اپنی صاف انگلیوں کے ہوسناک اشاروں سے اس کی دست درازیوں کو ایک زندہ دعوت عمل دے رہی تھی گویا ایک شہر ہفت رنگ کی نظر فریبیوں سے آراستہ ہو کر اس کی جوانی کو سرآری حسرت تکمیل ارمان تکمیل مدعا کا ایک سنہری پیغام دے رہا تھا

مسعود جو اس وقت اپنی ساری ہستی کو سیرت رایہ تکمیل کی سے فروشی

آغوش میں سرد کئے ہوا تھا۔ ایک ایسی آوارس کرجس میں بے پروائی اور سنجیدگی آزادی اور تکلف لعمہ اور شور ایک عجیب انداز ہم آہنگی سے ملے ہوئے تھے چونک پڑا۔ اور یوسف کے ہاتھ کے بوجھ کو اپنے کندھے پر محسوس کر کے اس خود فراموشی کے جواز کے لئے بہانے تلاش کرنے لگا۔ یوسف نے اس کو یوں کھویا ہوا سا پاکر خود ہی گفتگو میں پیش قدمی کی۔

"واہ بھئی مسعود جانے پینے کا بھی نہ اچھا وقت نکالا ہے" مسعود نے اتنے عرصے میں اپنے پریشان حالات کو ایک ساماں کوشش سے مجتمع کر لیا اور اسی فقرے کو سلسلۂ کلام کا بہانہ بناتے ہوئے ذرا اکڑ کر جواب دیا "کیوں صاحب وعدوں کو آپ اسی طرح پورا کیا کرتے ہیں کیا وقت کی پابندی اسی کا نام ہے۔"

یوسف نے لبوں ہی لبوں میں مسکرا کے اور اپنے آپ کو ایک نرم کی آرام کرسی پر گرا کے کہا" وقت کی پابندی؟ مجھے ہر پابندی سے نفرت ہے میں وقت کا غلام نہیں وقت کو میرا غلام ہونا چاہئے وقت کی لعنت زندگی کی دلچسپیوں کو مٹا دیتی ہے" یہ کہہ کر یوسف نے کسی رسمی اجازت طلبی کے بغیر خود ہی ایک پیالی میں چائے ڈالی اور اسے چمچے سے ہلاتے ہوئے پوچھا" مگر مسعود تم تو کہیں باہر جانے کو تیار نظر آتے ہو" مسعود نے ایک مایوسی سے بھرے ہوئے تمسخر سے کہا" کیا خوب! یوسف

کیا تم ابھی مصروفیتوں کو اس قدر جلد بھلا دیا کرتے ہو" اور پھر جب اس نے
یوسف کی آنکھوں کو ایک سرسری طلب احتجاج سے اٹھتے ہوئے دیکھا تو
اس نے اپنے حال میں خفیف سے ایک کھوئی ہوئی بات یاد کرانے کی کوشش
کی۔ مگر اس کے ہر لفظ میں حاشیہ داری کی ایک غیر معلوم رو دوڑ رہی تھی۔
"مجھے یہ علم نہ تھا کہ تم ایک عورت کے سامنے بھی جھوٹ بول سکتے ہو۔
ایک منتظر عورت کو بھی مایوس کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ یاد کرو۔ تم نے
کل رات کو کسی سے کوئی وعدہ بھی کیا تھا یا نہیں؟"

یوسف نے ایک تعجب انگیز بیگانگی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔
"مسعود میرے لئے کل رات آج کی صبح کے طلوع ہوتے ہی ختم ہو گئی۔
تم ابھی تک ایک گزرے ہوئے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہو
اور مجھے بھی مجبور کر رہے ہو کہ میں آج کی زندگی کو کل کی موت کے مرثیہ
میں صرف کر دوں۔ میرے کل کے وعدوں کو ماضی کے سیاہ اور وسیع
قبرستان کے کسی تاریک اور گمنام گوشے کی کھدری ہوئی خاک میں تلاش
کرو۔ تم نے کیا کہا۔ عورت کے سامنے جھوٹ بولنے کا حوصلہ۔ میں تم
سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم عورت کے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔
اگر ایسا ہے تو تم سے زیادہ کوئی بزدل نہیں۔ تم عورت کے نازک دل
کو صدمہ پہنچانے کی جرات کرتے ہو۔ سنو عورت صرف جھوٹ کو پسند

کر لی ہے سچائی میں عورت کے مصنوعی احساس کو مطمئن کرنے کی کوئی سمت نہیں۔

مسعود نے یوسف کے دماغ کی متضاد ترکیب سے مایوس ہو کر اس بحث کو وہیں روک دینا پسند کیا۔ اور موضوع گفتگو کو بدل کرنے کے لئے کہا

"یوسف آؤ تم صرف میرے ساتھ چلو میں اپنے وعدے کو پورا کرنا چاہتا ہوں" یوسف نے مضبوطی سے کہا "نہیں مسعود تم آج نہیں جاؤ گے میں تمہیں نہ جانے دوں گا۔ تم میں ایک عورت کی عصمت کو برباد کرنے کے لئے کافی اخلاقی جرأت نہیں"۔ مسعود نے اسے اس کو اپنی نگاہوں میں کچھ دلیل سا محسوس کرتے ہوئے جواب دیا تو کیا تم مجھے کل اس قدر رذیل سمجھتے تھے کہ تمہیں مجھ سے ایسے بڑے گناہ کے ارتکاب کی امید تھی"

یوسف نے سگرٹ جلا کر اور اس کا ایک کش لے کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں کل میں تم کو عقل مند سمجھتا تھا اور آج ضرورت سے زیادہ سرکش سچ ہے انسان ہی ایک ایسا حیوان ہے جس میں عقل نہیں"۔

مسعود نے یوسف کے اس جھوٹ کا جھوٹ کو اس کی فطری

کج نگاہی پر محمول کر کے اپنی طبیعت کو اس کے فلسفہ کو نہ سمجھنے کی کوشش کرنے پر رضامند کرنا چاہا۔ مگر پھر خود بخود ہی یوسف کی اس مذاقیہ طرز گفتگو کو اپنے جذبات کی توہین سمجھ کر ایک ارد ٹھے ہوئے بچے کی طرح دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" یوسف مجھے تم سے کبھی امید نہ تھی کہ تم میرے جذبات کی ہنسی اڑاؤ گے اور میری محبت سے مذاق کرو گے"۔

یوسف نے شاید عمداً یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مسعود کی اس مایوسی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ ایک قہقہہ لگا کر جواب دیا" مسعود اس دنیا میں مذاق کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ جو لوگ دوسروں پر نہیں ہنستے۔ ان پر دوسرے لوگ ہنستے ہیں۔ میں یہ موقع کسی دوسرے شخص کو دینا پسند نہیں کرتا"۔

مسعود نے گویا خود بخود ہی من کر اور ایک شرمیلی مسکراہٹ سے آنکھوں اور لبوں کے اندر ہی اندر مسکرا کر یوسف کے چہرے کا مطالعہ کیا اس کی آنکھوں کو ایک حوصلہ افزا دعوت اعتماد سے روشن پا کر اس نے ایک گہری لمبی اور راز دارانہ آواز میں کہا" یوسف مجھ کو اس عورت سے محبت ہو گئی ہے" اور پھر اس دن بھر کی کوششوں سے چھپائے ہوئے جذبے کا اعتراف اپنی زبان سے سن کر اس کے اندرونی نظام

میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ گھر گھر کے برسنے والے بادلوں سے
زیادہ زور سے گرج گرج کر کوندنے والی بجلی سے زیادہ سرعت سے
رُک رُک کے نکلنے والے نالوں سے زیادہ جوش سے ہر سرحد
ہر ایک سے بے نیاز ہو کر یوسف کی ساعت بہ ساعت بڑھنے والی الماری
سے جو آخر کار اس وقت جب مسعود نے اپنی تقریر کو ختم کیا ایک جبر
میں تبدیل ہو گئی بے پرواہ ہو کر اسی پہلے فقرے کے سلسلہ میں کہتا چلا
گیا "عشق ہو گیا ہے، میں نے اس کی ایک محبت سے بھری ہوئی نگاہ
میں اپنے حسن کی قیمت، اپنی جوانی کا انعام، اپنی آرزوؤں کا مآل حاصل
کر لیا ہے میں اس ایک لمحہ کو ایک بار پھر دیکھنے کے لئے محسوس کرنے
کے لئے اپنی پچھلی زندگی کی تمام عمر میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں،
تم کہو گے وہ نیک نہیں، پارسا نہیں مگر سنو وہ خوب صورت ہے
خوب صورت چیز کبھی بری نہیں ہو سکتی ایک خوب صورت عورت جو
کچھ کرتی ہے وہی نیکی ہے۔ اگر تم مجھے کسی نہ کسی طرح یقین بھی
دلا دو کہ وہ سیاہ کار ہے اس کی زندگی صرف گناہ اور فریب سے آراستہ
ہے تو بتاؤ کیا یہ میرا فرض نہیں کہ میں اس کو بچا لوں جس طرح اس نے
مجھے بچا لیا ہے وہ دنیاوی ثروت کے اعتبار سے کم مایہ ہی سہی مگر
کیا حسن اپنی سفارش کے لئے کسی دوسری چیز کا محتاج ہو سکتا ہے

کیا محبت محبت کے سوا کسی دوسری کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہے میں اسے ہر چیز سے جو میری دولت میرا جسم میری روح دے سکتی ہے مالا مال کر دوں گا۔ میں ایک خوبصورت بت کی طرح اس کی پرستش کروں گا شادی کو میں آج تک ایک ڈراؤنی چیز سمجھتا تھا۔ سوہی کو مرد کی آزادی کی غاصب، اس کی زندگی کی دشمن اس کی ترقی کی سد راہ جانتا تھا مگر اس عورت کے حسن نے میرے دماغ کی سلطنت میں ایک انقلاب، میرے دل کے حساسات میں ایک تغیر میرے زاویہ نگاہ میں ایک تبدیلی پیدا کر دی ہے اس نے مجھے ایک ایسی زبان میں جس کو تم نہ سن سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے سکھا دیا ہے۔ کہ میری ترقیاں اسی کی ترکت کی محتاج، میری زندگی اسی کی محبت پر منحصر ہے اس نے مجھے آزادی سے نفرت کرنا سکھا دیا ہے۔ اس نے مجھے ایک دوسری مرضی کا پابند بنا دیا ہے میں اس سے شادی کروں گا۔ میں اسے اپنا کر اس کا ہو جاؤں گا۔ میں اس کے بغیر اب ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا" یوسف نے ہنستے ہوئے جب کہ اس کی گہری آواز ایک خندہ لرزاں کے ساتھ بلند اور پست ہو کر ایک ماتمی نغمہ کی کیفیت پیدا کر رہی تھی زیادہ تر اس نظریہ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے اور شاید ایک غیر محسوس طریق سے اس کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے سگرٹ کے دھوئیں کی پیچ پیچ اور پریشان رفعتوں کا

مطالعہ کرتے ہوئے کہا" ایک غلطی کا علاج دوسری غلطی سے نہیں کیا کرتے، محض ایک بہت غلطی ہے، شادی اس غلطی کا ایک اس سے زیادہ مہیب اور دردناک علاج ہوگا تم مسعود اس تحریر کی تلخی سے واقف ہو۔ میں اس کے متعلق اور کچھ نہ کہوں گا تم اس وقت ایک مرض میں مبتلا ہو مریض کو اس کی اصلی حالت سے آگاہ نہیں کرنا چاہیئے اس کے مرض میں ترقی ہو جاتی ہے مگر تم اپنی وطن کے جاگتے ہوئے تقاضوں پہ ایک ناجائز ایک نامنصفانہ ظلم کر رہے ہو یہ تمہارا آخری عشق نہیں ہے۔ صرف پہلا عشق ہے جذبات کو ان کے اصلی نام سے موسوم کرنا چاہیئے اگر تم زندہ ہو۔ اور اگر تمہارے جذبات ضرورت سے اسی قدر زیادہ ہیں جس قدر تمہاری گفتگو سے ظاہر ہو رہے ہیں تو تم کل صبح سے پہلے پہلے کم از کم ایک درجن سے زیادہ عورتوں سے عشق کرنے کا حق رکھتے ہو آؤ میں تمہارے ساتھ چلوں گا ابھی تم نئے تجربات کے آتشی کھیل خانہ میں تنہا جانے کی قابلیت نہیں رکھتے تم کو ابھی ایک ناکامیاب شخص کی ہدایت کی ضرورت ہے میں صرف ایک عورت کو تمہارے جس کی نایاب جائداد تمہارے جذبات کی نادر متاع کا اجارہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا چلو دیکھو کتنے حسن اپنی عشوہ گر تماشوں کی محفلوں سے بے قرار ہو کر تمہاری محبت کا انتظار کر رہے ہیں کئی محبتیں اپنی بے پرستش نمائشوں کی امنگوں سے

بیدار ہو کر تمہارے حسن کو تلاش کر رہی ہیں۔"

یوسف کی تقریر نے مسعود کی خودی اور خود غرضی کو جسے ایک عورت کی محبت نے ایک گہری نیند میں سلا دیا تھا آہستہ آہستہ جگا دیا اور مسعود پھر ایک اس سے بھی بہتر محبت کے حصول کی حکمات پر غور کرنے لگا۔ احساس بھری وسربری یقیناً اس کی اس نئی محبت کی خامی اور اس کی عمل کی پختگی کا ثبوت تھا مسعود نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا مگر یوسف کی آنکھ نے مسعود کی محجوب تفکر سے زیر بار آنکھوں، سرگرمی اندیشہ سے پُر شکن پیشانی، مصروفیت عمل سے ساکن جسم کا مطالعہ کر کے فیصلہ کر لیا کہ ابھی مسعود کی بیماری لا علاج نہیں، ابھی آرزو اپنے انتہائی مدارج سے ناآشنا ہے، ابھی دماغ دل پر غالب ہے اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اور میز پر رکھے ہوئے سگرٹ کے ڈبے سے اپنا سگریٹ دان بھر کر دروازے کی طرف چل دیا مسعود نے شاید یوسف کے اصرار طلب انکار پر اعتماد کر کے یا اس کی بہانہ پرور پہلو تہی سے حوصلہ پاکر اپنے دل کو اس کی رائے کی پابندی پر رضامند کر لیا اور ایک ضدی نگر ور بچے کی طرح یہ کہ کر سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے یوسف کے ساتھ جا ملا" جہاں جی چاہے چلو مگر سب سے پہلے میں تو تمہیں اسی کے ہاں لے چلوں گا جس نے میرے دل کو ایک نئے مطالبے سے معمور، میرے دماغ کو ایک نئی تشنگی سے لبریز، میری روح کو ایک نئی خواہش

سے سرشار کر دیا ہے۔"

(۵)

یوسف، مسعود کو آج کہاں کہاں لئے پھرا اس کی خبر نہ یوسف کو ہوئی نہ مسعود کو۔ مسعود ایک مسحور، معمور بچے کی طرح صرف یوسف کی پیروی کرتا رہا اور یوسف اپنے گناہ سے رنگے ہوئے ضمیر کے ناقابل اعتماد تقاضوں کی رسی پر سہارا کئے اخلاق انسانی کو پرکھنے کے لئے نئی نئی آزمائشوں کی تلاش میں سرگرم رہا یوسف اور مسعود کی آج سب بھر کی مصروفیوں کو اگر کوئی دوسرا شخص فطرت انسانی کے نقاد کی حیثیت سے مطالعہ کرتا تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ انسان ہی انسان کا شیطان ہے یوسف نے مسعود کو آج اس حسن کے بازار کے قریباً ہر ایک مکان کی سیر کرادی وہ اس سرگرمی، اس ذوق و شوق، اس تعمل سے اس کام کو سرانجام دے رہا تھا گویا یہی اس کی زندگی کا سب سے ضروری فعل ہے اور اگر یہ تکمیل کو نہ پہنچا تو اس کی زندگی صبح ہونے ہی سے نسل مرام ختم ہو جائے گی۔

مسعود نے ہر چند چاہا کہ وہ یوسف کو وہاں جانے پر رضامند کرے جہاں دوبارہ جانے کی خواہش اس کو کل رات سے بے قرار کر رہی تھی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا یوسف، اس کے حواس کو اپنے دلکش اور حیرت انگیز

جذبات سے مدہوش اور اس کے تحمل کو سنے اور عجیب احساسات کے سربستہ رازوں سے سرشار کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اس بازار کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا۔ تو سب سے پہلے مکان کی سیڑھیوں کے قریب کھڑا ہو کر اسے دماغ پر ایک نمایاں کوشش سے زور دیتے ہوئے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شاید اپنی عمر بھر میں پہلی دفعہ کچھ سوچ سمجھ کر بات کرنا چاہتا ہے کہنے لگا۔

" مسعود یہ رات تمہاری زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہونے والی ہے اس کے استقبال کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بہت سال گزرے اسی طرح کی ایک رات میری زندگی میں بھی آئی تھی میں آج جو کچھ بھی ہوں اسی ایک رات کا نتیجہ ہوں " مسعود جو کسی غیر معلوم شرم کے احساس سے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گردن کو خم کر کے اپنی ٹھوڑی کو گلوبند میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اسے بوٹ کی نوک سے ریت کو ٹھکرا ٹھکرا کر یوسف کی باتوں میں معنی تلاش کرنا چاہتا تھا یہ آخری فقرہ سن کر کچھ مضطرب سا ہو گیا اور جب اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر یوسف کو دیکھا تو وہ اور زیادہ مضطرب ہوا یوسف کی آنکھیں کسی نہ نکل سکنے والے دریا کی طرح آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ان میں ایک عجیب آگ کے شعلے اس طرح جھلک رہے تھے جس طرح بہت سی روشنیوں کا ایک مجتمع عکس چلتے ہوئے پانی میں

ٹرٹر کر ایک متحرک سیلابِ آنسوؤں میں جا رہا ہے۔ اس کے زرد مگر صاف چہرہ پر اس کے مرحوم جذبات کی سیاہ یاد ایک تاریک گھٹا کی طرح چھا کر اس کے معمولی رنگ کو متغیر کر چکی تھی۔ مسعود نے دیکھا کہ یوسف کی صورت یک لخت ڈراؤنی اور خوفناک ہو گئی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ پہلے سے زیادہ دلکش، زیادہ دردناک، زیادہ قابلِ رحم ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والی طبیعت کے فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر اس غیر معلوم اضطراب کے لئے جس نے یوسف کو ظاہراً طور پر اس قدر خطرناک بنا دیا تھا اس سے اظہارِ ہمدردی کرنے کو ہی تھا۔ اور سوچ رہا تھا اس جذبے کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ یوسف نے درازک کر اپنے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھا "آج تمہارے فطری میلان اور نیکی و بدی کی مہیب قوتوں میں جنگ ہونے والی ہے۔ اپنی طاقت مدافعت کا مطالعہ کر لو۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہ برا بنا سکتا ہے نہ اچھا۔ اچھی سے اچھی چیز ایک برے آدمی کے ہاتھ میں بری اور بری سے بری چیز ایک اچھے آدمی کے ہاتھ میں اچھی ہو جاتی ہے۔ ایک انسان زیادہ سے زیادہ فقط یہی کر سکتا ہے کہ کسی دوسرے انسان کے ان ذاتی جذبات کو ایک مادی صورت میں منتقل کر دے۔ جن کو ظاہر کرنے کی وہ خود جرأت نہیں کر سکتا۔ کمزور لوگ اسی شکست کی تلخی کو مٹانے اور اپنے اعمال کی سزا سے

سمجھنے کے لئے دوسروں کی رعیت کو بہانہ بنالیے ہیں اور نہیں جانتے
کہ وہ اس طرح اپنے اخلاق کی پستی، اپنی انسانیت کی ذلت، اپنے مذاق
کی بدمذاقی کا سب سے بڑا ثبوت بن جاتے ہیں۔ رات کو جو کچھ تم نے
دیکھا۔ آج اس سے بہت زیادہ دیکھو گے۔ رات کو جو کچھ تم نے سنا آج
اس سے بہت زیادہ سنو گے۔ مسعود اب تک تمہاری زندگی ایک محدود
احاطہ میں ایک معین محور کے ارد گرد گھومتی رہی ہے۔ رات کو پہلی دفعہ
تم نے اس محور سے الگ ہٹ کر اس وسیع دنیا کے ایک گوشہ پر ایک
اٹھتی ہوئی نظر ڈالی اس نئے نظارہ نے تمہیں مسحور کر دیا۔ تمہاری نادانی
اور معصومیت نے اس غیر معمولی کیفیت کو محسوس کر کے فیصلہ کر لیا، کہ
وہی ایک منظر تمہاری زندگی کا مآل، وہی عورت تمہاری حسرتوں کا مقصد
اور صرف اس کی محبت تمہارے حسن کی سب سے بڑی قیمت ہے۔ تم
اس وقت سے اپنی اس نئی پیاس کو اسی چیز سے جس نے یہ پیاس
بھڑکائی تھی، بجھانے کے لئے وہاں جانے پر اصرار کر رہے ہو۔ اگر میں
تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو تم صرف یہی کرتے۔ کہ ایک قید سے نکل کر
دوسری قید میں مقید ہو جاتے۔ ایک مرکز سے آزاد ہو کر ایک دوسرے
مرکز کی جاذب کشش میں جذب ہو جاتے۔ میرے اس احسان کو نہ بھلانا
وقت آئے گا کہ تم مجھے بُرا کہو گے، بُرا سمجھو گے۔ مگر میری اس نیکی کو یاد

رکھنا۔ آج میں تمہاری آنکھوں کو ایک نئی روشنی سے روشن کر دوں گا۔
آج میں تمہارے دماغ کو ایک نئی وسعت میں حرکت کرنا سکھا دونگا
آج میں تمہارے دل کو بہت سے نئے جذبات سے سرشار کر دونگا۔
اور پھر تم ایک دولت مند وسیع النظر آزاد انسان کی طرح اپنی قوت
انتخاب کو استعمال کر سکو گے اپنے حسن کے لئے بہتر سے بہتر قیمت
حاصل کرنے کے مواقع تلاش کر سکو گے اپنی محبت کے عوض میں
نایاب سے نایاب حسن خریدنے کی ضرورت محسوس کر سکو گے۔ اور جب
تم کو کوئی عورت اپنی کبھی نہ تبدیل ہونے والی محبت سے بھکا دیگی
تو تم مایوس ہو کر اپنے جذبہ محبت کو خودکشی کرنے پر مجبور نہیں کرو گے
بلکہ ایک نئے شوق سے بیقرار ہو کر ایک نئی حرارت سے زندہ ہو کر
ایک نئے اعتماد سے مطمئن ہو کر اپنی محبت کی عارضی حفاظت کے
لئے کسی نئے امانت دار کو ڈھونڈھ نکالو گے وفاداری مسعود ایک
مفلس طبیعت کا سرمایہ ہے محبت بے شک ایک ناقابل تغیر جذبہ
ہے مگر اس کی زندگی کے لئے اس کو ایک یکساں حالت پر قائم رکھنے
کے لئے ضروری ہے۔ کہ اس کا مقصد اس کا مدعا اس کا میدان
مسلسل تبدیل ہوتا رہے۔ آہ میں کس قدر چاہتا ہوں کہ تم کو ان نئے
تجربات کی لذت سے محروم رہنے دوں۔ صرف اس لئے کہ مجھے

تم پر رشک آتا ہے۔ کاش کہ میرے پاس بھی اس وسیع تجارت گاہ کی
سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے اسی قدر سرمایہ ہوتا جس قدر تمہارے
پاس ہے۔ مگر ایک ترقی کرنے والی روح کے اضطراب کو ترقی کے
انتہائی معراج کے سوا کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی آؤ ایک ستاروں
سے بھرے ہوئے آسمان سے زیادہ آباد۔ زیادہ روشن۔ زیادہ خوبصورت
دنیا کے دروازے کھلے ہیں ان میں داخل ہو۔"

یہ کہہ کر یوسف نے مسعود کی طرف ایک متوقع نگاہ سے دیکھا۔ مسعود
نے ایک اپنی مرضی کے بغیر چلنے والی کل کی طرح آگے حرکت کی۔ اور
یوسف کے قدم بہ قدم اس مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اسی طرح
ایک ایک کر کے یوسف نے مسعود کو آج ایک رات کے معدود گھنٹوں
میں اس بازار کے سب مکانوں اور مکینوں کی سیر کرائی۔ وہ مسعود کو
ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف اس طرح لئے جا رہا تھا جس
طرح ایک ماہر آثار قدیمہ کسی نئے شائق عجائبات کو کسی عجائب خانہ کی
سیر کراتا ہے۔ وہ برابر ایک لگاتار غیر منقطع سلسلۂ کلام میں ان حسن
فروشوں کے ذاتی اشارات، ان کے خط و خال کی مختصر خصوصیات،
ان کی آرائشوں کے پنہاں اسرار بیان کرتا رہا۔ اور جب مسعود کسی
ایک عشوہ گر کو مشکل سے سمجھ لینے کے قابل ہو کر اس کو ایک تشنگی شوق

سے لبریز نگاہوں سے دیکھنا شروع کرتا تو یوسف سا بد اس کی پیاس کو اور بھڑکا دیتے یا ایک بیدار ہوتی ہوئی امنگ کو پھر ایک عارضی نیند میں سلانے کے لئے، کسی جھوٹے بہانے سے اظہار مجبوری کر کے وہاں سے چل دیتا۔ مسعود حیران بھی تھا اور خوش بھی پریشان بھی تھا اور مطمئن بھی، مگر نہ اس کا دل اس لاحاصل جدوجہد سے تنگ آ کر واپس جانے کو ہی چاہتا تھا نہ اس نے مقصد سفر کو جاری رکھنے کا ہی آرزومند تھا۔ نظارہ کی کثرت اس کے شوق تماشا کو بڑھا رہی تھی، نئے عجائبات کا مشاہدہ اس کو ان سے زیادہ عجیب نادرات کے دیکھنے کے لئے بیقرار کر رہا تھا۔ تماشائے نا تمام تجدید کر جل اٹھنے والے شعلے کی طرح مٹ مٹ کر زندہ ہو رہی تھی۔

اس دورۂ سب گردی میں سب وہ اس مکان کے دروازے پر پہنچے جہاں کل رات کو مسعود نے اپنے خیال میں دنیا کا بہترین حسن دیکھ پایا تھا اور حسن کی جھلک ایک بار پھر دیکھنے کے لئے وہ دن بھر اس قدر آرزومند رہا تھا۔ تو مسعود نے یوسف کا بازو پکڑ کر اسے اندر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

"یوسف تم تو کہتے تھے کہ اس مکان پر نہ جائیں گے۔ اب اس کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو رات کو ہی بھر کر دیکھ لیا ہے"

ختم ہونے کو ہے اور ابھی دیکھنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ چلو آگے چلو"
یوسف نے مسعود کو کنکھیوں سے دیکھ کر اور زور سے ہنس کر کہا
"ہا ہا ہا جو کچھ کہنا تھا میں ہی کہنا تھا۔ تم تو کچھ نہیں کہتے۔ اچھا
ایک دن تم بھی بولنا سیکھ لوگے۔ چلو اس دوسرے مکان پر چلو"
مسعود ایک بات دیکھ کر ضرور متعجب تھا جس کسی مکان پر وہ گئے
یوسف کا اس طریق سے استقبال کیا گیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا
کہ سب کے دلوں میں یوسف کی محبت اور عزت جاگزیں ہے۔ اس
نے دیکھا کہ ان کے پہنچتے ہی ان دولت کی بیٹیوں میں سے ہر ایک
ہرجائی کسی اضطراری احساس سے تڑپ کر اپنی خودداری اور معروف
خصوصیت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے عقیدت مند پرستاروں کی اشتباہ
رقابت سے مستقل نظروں کو ایک حسن بیتابی اور رحم اسرو سے ٹھنڈا
کرکے ان کو لینے کے لئے دروازے تک آتی۔ اور جب تک وہ بیٹھے
رہتے ان کی توجہ کو اپنے عشوہ فروش خاطرداریوں سے مصروف
رکھنے کو ہی مآل زندگی تصور کرتی۔ مگر ہر مکان سے رخصت ہونے
سے پہلے پہلے مسعود کا دل ان ہنس فروشوں کے انداز اظہار سے
یک مبہم سے شک میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور وہ یہ تمیز نہ کر سکا کہ
آیا یہ عرضِ ناز و نیاز یوسف کی محبت کا خراج ہے۔ یا اس کے اپنے

حسن کو بھسانے کے لئے ایک زندہ دام تذویر۔ اور جب یہ خیال اس کے احساسات کو خود ہی گدگداتا تو اس کا دل ایک عجب غرور، ایک عجب سا دماغی ایک عجب کامیابی کے نشہ سے مخمور ہو جاتا۔

ایک نہایت ہی خوب صورت مہ جبیں نے جس کا شفاف لباس عریانی سے زیادہ محرکِ تحمل تھا۔ ان کو رخصت کرتے وقت اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سر کے اوپر ایک مرمریں محراب کی شکل میں پیوستہ کر کے اور اپنے چہرے کو ذرا پیچھے کی طرف جھکا کر کچھ اس انداز سے مسعود کی طرف دیکھا کہ اس کے دل میں یونانی بت گری کی فطرت پرست صنعت کی دلفریب یاد تازہ ہو گئی۔

ایک دوسری فتنۂ روزگار حسن نے اپنی بلوریں کلائی کی برہنگی کو ہاتھی دانت اور سیاہ کانچ کی کئی پتلی پتلی چوڑیوں سے چھپانے کی ناکام کوشش کر رکھی تھی۔ جب ایک نقرئی خاصدان میں پان پیش کرنے کے لئے اٹھی۔ تو اس نے اپنے تمام بدن کو الگ ہٹاتے ہوئے، اپنے ہاتھ کو ایک ایسا نازک سا جھٹکا دے کر آگے کی طرف بڑھایا اور ان چوڑیوں کی جنبش سے ایک ایسی دلآویز جھنکار پیدا ہوئی جس نے مسعود کے دل میں ایک چٹکی لے کر اس کے دماغ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کہ اگر موسیقی کبھی کسی زندہ اور متحرک جسم میں مقید ہونے کی تمنا رکھ سکتی ہے

تو وہ بھی نغمہ بہ جسم ہو سکتا ہے۔
ایک اور کم سن آفت جاں جس کے صبیح خون کی سرخی اس کے سپید گالوں کے باریک پردوں کے پیچھے اس طرح موجزن تھی جس طرح ایک سبزہ کی نیلاہٹ میں سے سرخ اور مرجوش نراب جھلکتی ہے۔ اس کو دروازے سے داخل ہونے دیکھ کر کچھ ایسی شوخی، ایسی لچک، ایسی نزاکت کے ساتھ اٹھی کہ مسعود کا دل اس احساس سے کانپ اٹھا کہ کہیں یہ سپید اور سرخ روغنی مٹی کی بنی ہوئی گڑیا اس اضطراری حرکت سے ٹوٹ نہ گئی ہو۔ اور پھر جب اس نے اس کو صحیح و سلامت بغیر کسی ترغیب کے چٹکنے والے غنچوں کی طرح کھکھلاتے ہنسے اور بغیر کسی کھلونے کی موجودگی کے صرف ہوا کی موجوں سے کھیلتے ہوئے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ کوشش ضبط کے باوجود یہ کہنے سے نہ رک سکا۔

"یقیناً ایسی حوروں کی حفاظت کے لئے ایک بلوری غلاف کی ضرورت ہے"۔

غرضیکہ اس نے آج دوسروں کے حسن کی عجیب عجیب سحر کاریاں تو دیکھ لیں۔ مگر اس کو ایک ذرا سے شبہ کے سوا اس کا کچھ علم نہ ہوا کہ اس کا اپنا حسن کسی مغرور اور خود پرست ہستیوں کے حرم میں پندار پر بجلیاں

گرا کر کتنی فردوں کی کمزوری پر ہنسنے والی مضبوط عورتوں کے لیے پروا
دلوں پر آفت ڈھا کر آج ان کو بھی شکست آرزو، محرومی تمنا، ناکامی
حسرت کے داغ ہائے ناتمام سے آباد ایک اداسی مورس میں مبتلا
کر گیا۔

نسیم صبح کی سوئی ہوئی روح کو جگانے والی اور تھکے ہوئے دماغ
کو تروتازہ کرنے والی مسحور کن نکہت نے یوسف اور مسعود کو یاد دلا دیا کہ
ان کی بے پروا آزادیوں کی پردہ پوش رات ختم ہو چکی ہے۔ اور گھر گھر
بکھرنے والے سورج کی غماز شعاعیں ان کی پردہ دری کرنے کی فکر
میں تاریک رات کی پردہ داریوں پر غالب آنے کی جدوجہد میں سرگرم
ہونے والی ہیں۔ اب وہ اس حسن کے بازار کے دوسرے سرے کے
قریب پہنچ چکے تھے یوسف نے شہر کی پرانی فصیل کے دروازے
پر رک کر مسعود سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا جس سے
مسعود کو کچھ حیرت سی ہوئی۔ مگر یوسف نے اس کی متحیر آنکھوں سے
بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے اسے ایک ایک لفظ کو ایک غیر معمولی
سنجیدگی سے معمور کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "مسعود میں تم سے رخصت
ہوا ہوں ایک غیر معین زمانے کے لئے رخصت ہوتا ہوں۔ اب
شاید دیر تک تم مجھے نہ دیکھ سکو گے۔ میں نے ابھی دوستی کا درس

ادا کر دیا جو کام مطرب مجھ سے لینا چاہتی تھی تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اب تم کو میری ضرورت نہیں۔ مگر یاد رکھنا یہ رات تمہاری زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اب اپنی آئندہ زندگی کے دستور العمل کی ترتیب تمہارا کام ہے۔ تم اور صرف تم ہی اپنے ضمیر، اپنی دنیا، اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر اور مسعود کا ہاتھ جو اس وقت تک اس کے کسی فیصلے کے انتظار میں حرکت سے قاصر تھا، خود ہی پکڑ کر اور اسے ایک بھی محبت، اور اس سے زیادہ بھی حسرت سے جھٹکا دے کر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر فصیل کے دروازے کی طرف چل دیا۔ اور ابھی مسعود کا تھکا ہوا دماغ اس عقدے کو حل کرنے کے لئے بہت سی ناکامیاب کوششوں میں مصروف تھا کہ وہ اس شہر کی بیرونی خندق کی تاریک پہنائیوں میں غائب ہو گیا۔

(۴)

مسعود اپنی شب بھر کی سرگرمیوں کی تنقید میں مصروف، یوسف کے ناقابل فہم طرز عمل کے تبصرہ میں مشغول کچھ دیر تک شہر کے بیرونی باغ کی روشوں پر ٹہلا کیا۔ آج اس نے اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ صبح کاذب کی شیریں لطافت اور معطر خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا

اور محسوس کیا کہ سناٹا اس وقت کی بیداری، رات بھر کی گہری نیند سے زیادہ پُرکشش ہے۔

رات کی گناہ پرور تاریکی کا رنگ ایک سیاہ کار مجرم کی طرح سفیدۂ صبح کی معصومیت سے لبریز نورانیت کو قریب آتے دیکھ کر اڑا جا رہا تھا۔ ستارۂ صبح کی پہلی کرنیں محنت کر کے روزی کمانے والی آبادی کو بیداری اور عمل کا پیغام دے کر خواب راحت سے بیدار کر چکی تھیں۔ فضا و قدرت کی نورانی شعاعیں ایک اہم ذمہ داری کے احساس سے کانپ کانپ کر آفتاب عالمتاب کی لوح روشن پر ایک نئے دن کی زندگی کا دستورالعمل تحریر کر رہی تھیں۔

مسعود گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ملازم کوٹھی کی ڈیوڑھی میں جمع ہو کر ایک نمایاں بے چینی اور اضطراب سے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ اس کو آہستہ آہستہ ایک متفکر انداز سے کچھ سوچتے ہوئے آتے دیکھ کر سب ایک فوری حرکت سے اِدھر اُدھر بکھر گئے اور وہ اسی طرح اپنے دماغی ہیجان میں غلطاں ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب مسعود ایک پوری رات کے لئے اپنے مکان سے غیر حاضر رہا تھا۔ اس کی غیر حاضری نے اس مکان کے ہر مکین،

کو اسی اپنی جنت اور تعلق کے مطابق رات بھر پریشان رکھا۔ کسی کو اس کی نقل و حرکت کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور اس لاعلمی نے اس پریشانی کو اور زیادہ صبر آزما بنا دیا تھا۔ مسعود کے انتظار میں نہ کسی نے کھانا کھایا نہ کسی کو نیند آئی۔ مگر اس پریشانی کا اندازہ کوئی نہ کر سکتا تھا جس نے مسعود کی بیوی کے آرام و اطمینان کو ایک زبردست آندھی، زلزلوں کی طرح بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا۔ وہ ایک ایسی خانماں برباد چڑیا کی طرح جس کے گھونسلے میں آگ لگ گئی ہو رات بھر اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر بھڑک بھڑک کر تڑپ تڑپ کر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر حرکت کرتی رہی اس نے ایک ایک ملازم کو سر بہ سفیر اور ہو کر ماما کو مسعود کے متعلق دریافت کرنے کے لیے مردانے میں بھیجا اور ہر مرتبہ اپنی زندگی کو صرف اسی استفسار کے جواب پر منحصر کئے وہ اپنی مایوسیوں کو امید کی سنہری دلفریبیوں سے دھوکا دیتی رہی۔
مسعود گھر آیا بھی تو اس فریب خوردہ آرزو کی تمنا سے بے خبر اپنے متعلقین کے احتیاج تسکین سے بے پروا بڑے استغنا اور تغافل سے دن کو رات بنائے رات کی بیداری کی تھکن کا علاج کرتا رہا اور شام کو پھر تنہا دھوکا اور اپنے آپ کو ایک نہایت ہی خوش وضع لباس سے آراستہ کر کے اپنے نئے سبق کو دہرانے کے لئے تیار ہو گیا انسانی زندگی

میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب گناہ فطرت انسانی پر غلبہ پا کر
تمام حواس کو ان کی فعالیت سے معطل کر دیتا ہے جسم کا ہر ایک رواں
دماغ کا ہر ایک رگ و ریشہ صرف گناہ کے مہیب جذبات کو محسوس
کرنے اور ان کو ایک عملی صورت دینے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس
وقت انسانی عقل، انسانی رائے گناہ کے رنگ سے رنگی جاتی ہے۔
انسان اپنی زندگی کی نازک عنانِ حکومت گناہ کے کرخت ہاتھوں میں
دے دیتا ہے آنکھیں گناہ کی ڈراؤنی صورت میں ایک عجیب حسن تلاش
کر لیتی ہیں قوائے جسمانی گناہ کی شکل اور جذبات طلب مہموں کو سر کرنے
کی قابلیت محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ اخلاق کے مسلمہ اصول، ضمیر کے
روحانی نفاست، نیکی کے فطری جذبات انسانی خودرائی کو ایک کھلی
بغاوت پر آمادہ دیکھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

انسان نیکی اور بدی میں تمیز کرنا بھول جاتا ہے ہر وہ طاقت جو
اس کو اس وقت سے پہلے بدی سے بچاتی تھی اب اسے صرف بدکاری
کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک طبعی رجحان بن جاتی ہے معصومیت
کی کمزوری اس کی عصیاں کوش چیرہ دستیوں کے لئے ایک بہانہ عصمت
کی بے لوث پاکیزگی اس کی سیاہ کاریوں کے لئے ایک ترغیب، نیکی کی
غیر مدافعانہ رواداری اس کی نارواد دست درازیوں کے لئے ایک زندہ

دعوت حملہ آوری ہو رہی ہے۔ ہر نوع گناہگاری رفتہ رفتہ لمحہ
بہ لمحہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ جس طرح ایک خونخوار درندہ انسان کا لہو چاٹ
کر ابتدا ہر معمولی خوراک سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے اسی طرح ایک گناہ
کے عادی مجرموں سے مسلح انسان کسی بڑے گناہ کی لذت سے آشنا ہو کر
معمولی گناہوں کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور ان سے زیادہ بھیانک گناہوں
کے ارتکاب کے لئے ہر دم سوچتا ہے۔ مکمل ہوس آمیز ہوسکاری
کو چٹکاتی ہے اور حواس انسانی اپنی کارگزاریوں سے معطل ہو کر
اپنی تمام طاقتیں اسی ایک راہی جس معصیت انگاری میں مرکوز کر دیتے
ہیں۔ فطرت انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ سینکڑوں ستمگر و غاصب
حکمراں، ہزاروں غریب کش، سودخوار زرپرست، لاکھوں عصمت سوز،
ہوس پرور بدکار اپنے اپنے میدان عمل میں گناہ کی اس روز افزوں
دیوانگی سے بدمست ہو کر انسانی حقوق کی پامالی، اخلاق کی بلند عمارت
کی بیخ کنی کے درپے ہوتے رہے ہیں۔ اعمال انسانی کی یہ تاریخ اپنے
آپ کو آج بھی اسی طرح دہرا رہی ہے اور نہ جانے قیامت تک اسی طرح
دہراتی رہے گی۔ مسعود کی زندگی میں بھی یہی وقت آ گیا تھا۔ جن مدارج کو
وہ میں تھا اپنے دماغ کی اختراعات اور اپنے قوتی کی تحریکات سے برسوں
میں حاصل کرتا یوسف کی کارستانیوں کی بدولت اسے دنوں میں حاصل

رہ گئے۔ اس لیے اس کی زندگی کی کشتی کو ان داخلی نامعلوم جذبوں
کے آغوش ہلاکت میں سپرد کر دیا۔ یوسف کے خیالات نے مسعود کے
دماغ پر، مسعود کے افعال پر، مسعود کی روح پر آہستہ آہستہ قبضہ حاصل
کر لیا۔ اور اس وقت بھی جب یوسف کی شخصی موجودگی اس پر اپنا اثر نہ
ڈال سکتی تھی وہ اپنے آپ کو ان خیالات کے اثر سے جو اس کے کانوں
میں ایک زندہ فلسفہ حیات بن کر گونجتے رہتے تھے آزاد نہ کر سکا۔ چند
دنوں میں ہی مسعود صرف یوسف کے دماغ کا عکس، یوسف کے ضمیر
کی تصویر، یوسف کے جذبات کا اظہار بن گیا۔ اب اس کی زندگی بالکل
بے اصول ہو گئی۔ اس کی فطری ذہانت نے یوسف کی عقل سوز صحبت
سے متاثر ہو کر اس کی زندگی کو ہر شعبہ سے آزاد، ہر فائدے سے
بے نیاز، ہر انجام سے بے خوف بنا دیا۔ یہ زندگی ایک ایک لمحے
کے لیے بے شمار مستقل، غیر متعلق حصوں میں منقسم ہو گئی۔ یہ ایک ایک لمحہ
اس کے خیالات کی عارضی سرگرمیوں، اس کے جذبات کی گوناگوں نیرنگیوں
کا مرکز بن گیا۔ اب مسعود کے لئے نہ کوئی ماضی تھا، نہ مستقبل، نہ کوئی آغاز
تھا نہ انجام۔ نہ کوئی علت تھی نہ معلول۔ اس کے لئے اگر کوئی چیز
وقعت رکھتی تھی تو ایک زمانہ حال، جو وقت کی چھوٹی سے چھوٹی موجودگی
کا دوسرا نام تھا۔

یوسف حافظہ کو اس نے عملی طور پر ایک ارادی کوشش سے بے کار کر دیا۔ اندیشہ و احتیاط کو خود فراموشی کے خواب آور مرکب سے اس نے ایک ابدی نیند میں سلا دیا۔ اپنی زندگی کی عنان اس نے محض اتفاق کے غیر ذمہ دار ہاتھوں میں دے دی۔ اس کا کوئی خیال، اس کا کوئی لفظ، اس کا کوئی فعل اب کسی خاص مقصد کے لئے ذریعہ نہ تھا۔ بلکہ خود اپنے آپ میں ایک مقصد تھا جو اظہار کے بعد تکمیل کو پہنچ جاتا تھا۔ ہر چیز کو دیکھ کر اس کے حصول کی خواہش سے بیدار ہونا، ہر خواہش کو فوراً پورا کرنے کے لئے تیار ہونا اس کے نزدیک اب زندگی کا سب سے اہم مفہوم تھا۔ کسی شے کی بیرونی سطح کی پردہ دری کر کے اس کے اندرونی معانی کو تلاش کرنے کی جرأت کرنا اس کی رائے میں ایک غیر ضروری مذاق کا ناقابل معافی اظہار تھا۔ حواس کی متعدی مادیت نے اس کی روح کو ایک عجیب حساس جسمانیت سے معمور کر دیا۔ نیکی یا بدی کو وہ صرف محبت یا نفرت، مہربانی یا غضب، خوشی یا غم کی طرح انسانی طبیعت کے عارضی جذبات تصور کرنے لگ گیا جو پہلے کی تیاری یا بعد کی پشیمانی کی ضرورت کے احساس کے بغیر محض عناصر کے اتفاقی میلان سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اب دن رات اپنی رائے کو معطل کئے، نیکی اور بدی کی اس کو ایک عامیانہ کوشش سمجھ کر مطالبہ کی اس، لیکن جادو کی لکڑی

کے اشاروں پر جس کو اصطلاح عام میں گناہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حرکت کرتا رہتا اور خود اس کے سحر سے متاثر ہو کر ہر اس چیز کو جو اس سے مس کرتی اسی طرح مسحور کر دیتا تھا۔

خوبصورتی یا بدصورتی، مناسب یا نامناسب جائز یا ناجائز میں تمیز کرنے کے لئے اب اس کے پاس کوئی معیار نہ رہا فطرت نے اس بغاوت کا انتقام لینے کے لئے اس کو قوت انتخاب سے محروم کر دیا۔ اور وہ ایک ایسے پتھر کی طرح جو کسی پہاڑ کی اونچی بلندیوں سے گرنا شروع ہو کر کسی مرضی کو استعمال کئے بغیر کسی پستی میں امتیاز کئے بغیر صرف وادی کی زیریں اور اور عمیق گہرائیوں کی طرف گرتا رہتا ہے۔ بداخلاقی کی اسفل سے اسفل پستیوں پر بدکاری کی ذلیل سے ذلیل گہرائیوں میں گرتا رہا

وہ اپنی بیوی ہینس کی خوبیوں اور نیکیوں سے وہ بیزار ہو چکا تھا متنفر ہو گیا اور اس نے اسی دیوانگی گناہ کے ایک دورہ میں اس محبت و وفا کی زندہ دیوی کو ایک نہایت ہی مکروہ سلوک سے تنگ کر کے اپنے میکے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس وقت ایک ایسے مجروح پرندے کی طرح جس کو ایک سنگدل شکاری اپنے تیر جفا کا نشانہ بنا کر ذبح کرتا ہے احساس درد و مایوسی سے کھلی ہوئی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس نے ایک غیر فانی محبت، ایک لازوال وفا، ایک عمر بھر کے نباہ کا عہد

کر کے اس دولت کو لوٹ لیا تھا جو ایک عورت کا اس کی زندگی سے
بھی زیادہ عزیز اور گراں قدر سرمایہ ہے۔

وہ عورت جو مسعود کو وہ سب کچھ دے کر جو ایک عورت کی پہلی اور آخری محبت دے سکتی ہے اب کسی دوسرے مرد کی محبت کو خریدنے کے لئے بالکل نادار بالکل مفلس ہو چکی تھی جو ایک پروانے کی طرح جس کی پیدائش زندگی اور موت شمع کی صرف ایک چمک کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب مسعود کو دیکھنے کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ اسے شوہر کے گھر سے، جس کو چھوڑ کر وہ قبر کے سوا کسی اور گھر میں جانے پر رضامند نہ ہوسکتی تھی اس طرح رخصت ہوئی جس طرح ایک عزفاب قناجار و ناچار اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کے آخری تختے کو سمندر کی متلاطم موجوں کی نذر کر کے، زندگی کی سب امیدوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے دیکھ کر اور صرف موت کو ہی ایک یقینی انجام سمجھ کر اپنی تمام جدوجہد، تمام کشمکش سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

مسعود کی سرکش جولانیوں کو قابو میں لانے کے لئے یہ آخری عنان تھی جو ٹوٹ گئی، مسعود کے گم کردہ راہ دماغ کو ایک ذمہ دار زندگی کی یاد دلانے کے لئے یہ آخری نشان تھا جو فنا ہو گیا۔ مسعود کی زندگی کو اس گرداب فنا سے بچانے کے لئے یہ آخری امید بھی جو مٹ گئی۔ اب مسعود کا مکان جس

کی عزت اور پاکیزگی کو گناہ کے زہر آلود داغوں سے محفوظ رکھنے کے لئے
کوئی نسوانی حرمت محرک نہ ہو سکی تھی۔ مسعود کی ہوس پرستیوں کے
عجیب عجیب مظاہر کی نمائش گاہ بن گیا۔ اس میں وہ تمام انسانی
روح کو ڈسنے والے سانپ، انسانی عقل کا خون پینے والے بھیڑیے
بداخلاقی کے سرمایہ سے تجارت کرنے والے تاجر آ بسے جو ایک
دولت مند امیرزادے ایک عشق کے ہاتھوں بکے ہوئے غلام ایک
ہر سرپرست کی محافظت سے آزاد، ناتجربہ کار کے ہمدرد و رفیق مصاحب
بن کر اس کو دولت لٹانے کے نئے نئے اور دلکش طریقے سمجھانے کے
لئے، گناہ کے سنہری جال کی دن بدن مضبوط ہونے والی کڑیوں میں
پھنسانے کے لئے، مذموم حرکات کے تباہ کن اثرات سے کمزور کر کے
اپنے قابو میں لانے کے لئے عجیب عجیب تدبیریں سوچ لیتے ہیں جو
شہروں کی غریب آبادی کی عصمت کو سونے چاندی کا لالچ دے کر،
بھولی بھالی عصمت کو کبھی نہ پوری ہونے والی آرزؤں سے پھسلا کر،
اندھی جوانی کو خواہشات کی وارفتگیوں سے اندھا بنا کر، دنیا کو اخلاقی
بیماریوں میں مبتلا کرنے کا ایک آلۂ شیطان کی حکومت کو وسیع اور مستحکم
کرنے کا ایک وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اور جو انسانیت کی ان بلند مگر نازک
عمارتوں کو گرا کر، اپنی رہزنی کے شکاروں کو پیسے پیسے کوڑی کوڑی کے

لئے محتاج بنا کر ان کو ایک نظر دیکھنے یا دیکھ کر پہچان لینے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔

مسعود کے حسن نے اپنی جاذب کشش سے ہر ظاہری حسن پر مرنے والی اور اس حسن کو ہر ایک قیمت پر خریدنے والی عورت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ مسعود کی دولت نے ان نئے نئے بھولوں پر قربان ہونے والی تتلیوں کو ایک عارضی وفا کا سبق سکھا دیا۔

مگر ایک دن وہ بھی آیا جب مسعود کا دل اس طریقۂ جلس پرستی سے بھر گیا اور اس کی تھکی ہوئی نگاہیں ان حسن فروش زر پرست موم کی پتلیوں میں کوئی حسن نہ دیکھ سکیں۔

مسعود اب اپنی غلط کاریوں کو اپنے مکان کی پردہ پوش چار دیواری کے اندر محیط نہ کر سکتا تھا۔ اس کی ہر ضبط سے آزاد خواہشیں اب اپنی تکمیل کے لئے ایک اس سے زیادہ وسیع، زیادہ سے زیادہ مختلف النوع میدان عمل کی آرزومند تھیں۔ وہ اپنے آپ کو فطرت کا ایک نادر کرشمہ سمجھ کر اپنے حسن و جمال اپنی بدکاری کے کمال کی تعریف اس دنیا سے سننا چاہتا تھا جو اب تک اس کو نہ دیکھ سکی تھی۔ آہ جب انسان بدی کے انتہائی مدارج پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے عیوب کو بھی اپنی امتیازی خصوصیات، اپنی برائیوں کو بھی اپنی نیکیاں، اپنی ذلت کو

ہی اپنی عظمت سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اب وہ کبھی شہر کے شراب خانوں میں کثرت مے نوشی سے بدمست نظر آتا کبھی اس حسن کے بازار میں ساغر بکف اور مینا بدوش کبھی شاہدان بازاری کی آغوش عفلت فروش میں بےہوش نظر آتا کبھی کسی بدنظر نازنین کی تبسم ریز نگاہوں کی پیروی میں مصروف کبھی قمار خانوں میں اپنی کھوئی ہوئی دولت کی تلاش میں سرگرم نظر آتا کبھی اپنے اوباش دوستوں کے ساتھ مل کر اپنے باقی ماندہ سرمایہ کو اندھا دھند صرف کرنے میں مشغول غرضیکہ خود فراموشیوں کا ایک طویل دستورالعمل تھا جو ختم ہونے کو ہی نہ آتا تھا غلط کاریوں کی ایک لمبی فہرست تھی جو تکمیل کو ہی نہ پہنچی تھی۔

اسی طرح کئی برس گزر گئے ان ہی مشاغل میں ہزاروں دن رات بسر ہو گئے۔ اور وہ زمانہ بھی آگیا جب مسعود کی دولت کے دوست مسعود سے بیزار ہو گئے مسعود کے حسن کی متوالیاں مسعود سے متنفر ہو گئیں مسعود کی جوانی کی دیوانیاں مسعود سے منحرف ہو گئیں۔ کیونکہ ان کو اپنا والہ و شیدا رکھنے کے لئے مسعود کے پاس اب کچھ نہ تھا۔

دولت کے بے تحاشا صرف نے اس کو اس کی قوت برداشت سے زیادہ مفلس بنا دیا۔ زندگی کی بے اعتدالیوں نے اس کو اس کی طاقت مقاومت سے زیادہ کمزور کر دیا۔ ان بیماریوں نے جو حسن کی

تجارت گاہوں کی فضا میں مردم خوار بلاؤں کی طرح شکاروں کی تلاش میں دن رات منڈلاتی رہتی ہیں اس کے حسن کو بگاڑ دیا ایک ہیبت ازوقت بڑھاپے کی خزاں نے اس کی جوانی کی بہار کو اجاڑ دیا۔
اب مسعود کو ہر ایک شخص ایک متعدی بیماری سمجھ کر اس سے احتراز کرتا تھا۔ اب مسعود کو ہر ایک شخص ایک ڈراؤنی چیز سمجھ کر اس سے ڈرتا تھا۔

مگر مسعود ان عادات کے تقاضوں سے مجبور تھا جو گناہ کے زہر سے پل پل کر جوان ہو چکی تھیں ان حواس کے مطالبوں سے لاچار تھا جو بدی کی گود میں کھیل کھیل کر سرکش ہو چکے تھے۔

اس لئے جس غرض کو پورا کرنے کے لئے وہ اب قیمتی اور خالص شراب نہ حاصل کر سکتا تھا اس کو اس نے کم قیمت اور تباہ کن مرکبات سے تیار شدہ شراب سے پورا کیا۔ اور جب اس کی مفلسی اس صرف کو بھی برداشت نہ کر سکی۔ تو اس نے اپنے قویٰ کی گرتی ہوئی دیوار کو افیون، چرس، گانجے اور اسی قسم کی دوسری مہلک منشیات کے زہریلے پشتابانوں سے سنبھالنے کی کوشش کی۔ جب تشنگی ہوس کو بجھانے کے لئے اب وہ کسی نایاب حسن اور لاثانی جوانی کے بیش قیمت آب حیات کو نہ خرید سکتا تھا اس کو مٹانے کے لئے اس نے اپنی نادار قوت انتخاب کی مجبور افلاس

بد مذاقی کے حکم کی تعمیل کی اور جب اس کے حواس اس کے جذبات سے روگرداں اور اس کی ہوسکاری کامرانی سے ناآشنا ہوگئی۔ تو اس نے اس بازار کے تاریک گوشوں میں جس میں وہ چند سال گزرے ایک مغرور بادشاہ کی طرح داخل ہوا تھا ایک گمنام فقیر کی طرح بھٹک بھٹک کر اس داغ حسرت کو مٹانے کی کوشش کی

ایک عورت نے جس کی براحتیاج غریبی کو اس نے اسی دولت سے، جس کی کس مپرس محبت کو اس نے اپنے حسن سے جس کے فرہاد طلب جذبات کو اس نے اسی جوانی سے سیراب کردیا تھا۔ اور جس کی موجودہ فارغ البالی، شہرت اور کامرانی اسی کی توجہ کی شرمندہ احسان تھی۔ جب اس کو اپنے دروازے کی بیرونی سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ گزرنے والی بدبودار نالی پر اس کی دیوار کا سہارا لئے ایک پھٹے ہوئے کوٹ میں لپٹے ہوئے پڑا پایا۔ تو اس نے ایک سلطانی غرور سے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے ٹھکرا کر پرے ہٹ جانے کے لئے حکم دیا ایک دوسری عورت نے جو مسعود کی زندگی کے دوران بہار میں اکثر جوش رقابت سے جل کر اور اس کو حسرت مند نظروں سے دیکھ کر یہ کہا کرتی تھی "مسعود کاش کہ تم اس قدر غریب اس قدر بدصورت اس قدر کم دلکش ہوتے کہ تمہیں اور کوئی عورت پسند نہ کرسکتی اس وقت

اور صرف اس وقت تم کو معلوم ہوتا کہ میری محبت کس قدر بے غرض، کس قدر گہری، کس قدر سچی ہے۔" جب ایک دفعہ مسعود کو کسی خاص اندرونی ہیجان سے لڑکھڑاتے ہوئے اپنی مبہوت آنکھوں کو کسی پرانی یاد کی دھندلی سی روشنی سے روشن کر کے ایک پرامید انداز سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک ظاہرا کوشش سے آنکھ بچا کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ لیکن جب مسعود نے اس کے قریب جا کر اور مشکل سے اس کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر کے اسے یاد دلانے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے تو اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے اور بڑی غائر نظروں سے مسعود کو دیکھتے ہوئے ایک رکھائی ایک بے پروائی سے کہا "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں کبھی کسی مسعود کو جانتی تھی۔ کم از کم میں تم کو کبھی نہیں جانتی تھی۔ جاؤ اس جھوٹ سے کسی اور کو دھوکا دو۔"

ایک اور عورت نے جو ایک شریف گھرانے کی آبرو ایک معزز خاندان کی عزت تھی اور جو کسی زمانے میں مسعود کے حسن مسعود کی جوانی مسعود کی محبت کے جال میں پھنس کر آخر کار اپنا سر چھپانے اور پیٹ پالنے کی غرض سے اس حسن کے بازار میں اپنی لٹی ہوئی عصمت کے ناکافی سرمایہ سے تجارت کرنے پر مجبور ہوئی تھی جب مسعود کو گردن جھکائے اس کی نظر سے بچنے کے لئے اپنی کمزور ٹانگوں کو ذرا جلدی حرکت کرنے پر مجبور

کئے جس سے اس کا تمام بدن تھرتھرا رہا تھا اپنے مکان نیچے سے گرتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنا چہرا جو مسعود کے عصمت سوز حسن کو پامال۔ اس کی ہوش ربا جوانی کو برباد دیکھ کر ایک دردناک کامیابی کے احساس سے تمتما اٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر نکال کر ایک ضرورت سے زیادہ بلند اور غیر نسوانی آواز میں مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسعود دیکھا مجروح عصمت کی پکار کا اثر' مقتول شرافت کے خون کا داغ' ذرا میرے سامنے آؤ۔ میں تمہیں اچھی طرح دیکھوں۔ آہ قانون قدرت تم سے اپنا انتقام لے چکا مگر سنو میرے انتقام کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی"۔

(ے)

مسعود ایک شام کے ساعت بہ ساعت تاریک ہونے والے سایوں اور ایک گھنی گھر کے زمیں بوس بادلوں میں لپٹا ہوا فصیل کے اردگرد جانے والی سڑک پر چل کر اسی جس کے بازار میں جانے کے لئے جس میں اس نے اپنا حسن اپنی جوانی اپنی دولت کھوئی تھی شہر کے شمالی دروازے کی طرف جا رہا تھا وہ اس وقت ایک تکیہ سے آیا تھا جو شہر کے باہر ایک سنسان ویرانے میں واقع ہے اور جس کے غفلت کوش زائر اپنے غیر مشرب شہریوں کی نظر سے دور جا کر اپنے

سو اس کی تھکن کا علاج ایک عارضی خود فراموشی سے کرتے ہیں۔ اس کا جسم جس پر نہیں پھٹے ہوئے جھیتھڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو اپنی اندرونی حرارت سے گرم کرنے کے لئے گردن کو خم کئے بدن کو سکیڑ سکیڑ کر چل رہا تھا جس کے روح سوز شعلوں نے اس کی رگوں میں ایک عارضی تشنج، اس کے دماغ میں ایک عارضی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر نظارہ کو دیکھنے سے قاصر، اس کے کان ہر آواز کو سننے سے عاجز، اس کی عقل ہر حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھی۔ وہ اپنے اردگرد کی تمام موجودات سے بے خبر، صرف اپنے پاؤں کی عادی رہروی پر اعتماد کئے اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ اس کے پیچھے سے ایک بند فٹن جس کی کھڑکیوں پر پڑی ہوئی چلمنیں صاف شہادت دے رہی تھیں کہ اس میں کوئی دولت مند مگر باوضع امیرزادی یا کسی زردار مگر شریف رئیس کی بیگم شام کی تاریکی میں ہوا خوری کرنے کے لئے نکلی ہے۔ دو بادپیما گھوڑوں کے بازوؤں پر اڑتی ہوئی آئی۔ محتاط کوچبان، جس نے افق پر ایک اٹھتی ہوئی گھٹا کو دیکھ کر بارش کے شروع ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچنے کی غرض سے گھوڑوں کی رفتار کو ضرورت سے زیادہ تیز کر رکھا تھا۔ شاید اس غیر معمولی تاریکی میں غریب مسعود کو جو ایک لڑکھڑاتی ہوئی اور بہت

آہستہ چال سے درختوں کے گھنے سائے ہیں سڑک کے کنارے کنارے جارہا تھا دور سے نہ دیکھ سکا۔ ایک خطرناک قربت پر آ کر اس نے اسے دیکھا اور ایک اندیشہ سے لرزاں آواز میں اس ظاہراً طور پر اندھے اور بہرے رہرو کو خبردار کرنے کے لئے ایک مسلسل شور مچایا۔ اور ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے گھوڑوں کی لگام کو ایک اضطراری جھٹکے سے کھینچا۔ تند اور سرگرم رفتار گھوڑے اس فوری کشاکش سے بھڑکے مسعود کا مختل دماغ اس شور اور گڑگڑاہٹ سے اتنا گھبرایا کہ وہ اس جلدی میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا وہ سڑک کے کنارے کی طرف ہٹنے کی بجائے سڑک کے درمیانی حصے کی طرف جھکا اور اس سے پیشتر کہ گاڑی رکتی یا گھوڑے تھمتے۔ کرہ ہوا میں ایک دردانگیز چیخ کی گونج سنائی دی مسعود گاڑی سے ٹکرا کر اور اس سے کوئی چار قدم کے فاصلے پر گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ گاڑی رک گئی گھوڑے اپنی مغرور گردنوں کو بلند کئے اپنے نتھنوں کو پھلائے۔ اگلے پاؤں کو لگام کی کشش کے احساس سے ایک خوفناک اور مبہم رقص میں حرکت دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

دونوں بانگبر فوراً آگے بڑھے اور گاڑی کی لالٹین لے کر اس آفت زدہ رہرو کو دیکھنے کے لئے چلے مگر اسی وقت گاڑی کی کھڑکی کھلی۔ اور ایک بلند قامت عورت جو سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی

تھی باہر نکلی۔ کسی سوال کی ضرورت محسوس کرنے یا کسی نسخ کی منتظر ہونے کے بعد وہ اس ہر ظاہری لحاظ سے بے جان لاش کی طرف لپکی ہوئی بڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بالگیروں نے احساس رعب وادب سے اپنے چہرے دوسری طرف پھرا لئے۔ مگر اس عورت نے جس کی نسوانی ہمدردی اس وقت ہر پابندی وضع سے آزاد ہر حجاب ظاہری سے بے پروا تھی۔ ایک نمایاں اضطراب اور تعجیل سے بڑھ کر ایک بالگیر کے ہاتھوں سے لالٹین لے لی اور مسعود کے قریب آئی۔
مسعود گاڑی کے دھکے سے گر کر ایک طرف کو جھکا ہوا اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سر سے آگے نکل کر ہتھیلیوں کے بل زمین میں گڑے ہوئے تھے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس نے اس عالم بے ہوشی سے پہلے گرتے گرتے اپنے آپ کو ان کمزور ہاتھوں کے سہارے پر سنبھالنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس کا چہرہ دونوں بازوؤں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں سکڑی ہوئی تھیں۔ اس کے گھٹنے آگے کی طرف جھک کر پیٹ میں گھسے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تائب گنہگار اعتراف عصیاں اور افعال جرائم کی ندامت میں ڈوبا ہوا اپنے شرمسار چہرے کو دنیا والوں کی نظر سے چھپائے اس تاریک گوشے میں سربسجود پڑا ہے اور اس عجیب بے کسی اور بے بسی کے عالم میں کسی گناہوں کو بخشنے والے

عاجزی کو قبول کرنے والے شہنشاہ کی درگاہ میں عفو تقصیر کے لئے رو رو کر دعا کر رہا ہے۔ اس معزز خاتون نے اپنے ایک ہاتھ میں لالٹین لے کر دوسرے ہاتھ سے اس سرافگندہ محبوب کو ہلانے کی کوشش کی مگر ایک مہیب خاموشی ایک بے حس سختی کے سوا اس کی اس کوشش کا جواب اور کچھ نہ ملا۔ پھر اس نے اور زیادہ جھک کر اس کے ناتواں اور بے حرکت چہرے کو اپنی طرف پھرایا اور لالٹین کی مدھم روشنی سے جو اس تاریکی کو اور زیادہ بھیانک بنا رہی تھی اس کو دیکھا۔

ایک اور چیخ جو پہلی چیخ سے زیادہ دردناک تھی اور جس میں ایک عورت کے انتہائی کرب کی زوت ملی ہوئی تھی سنائی دی۔

شیریں مسعود کی سوی کبھی امید نہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو ایک دن اس حالت میں دیکھے گی۔ اسے سب کچھ دیکھنے کی توقع تھی۔ مگر اس منظر کو دیکھنے کے لئے وہ کبھی تیار نہ تھی۔

وہ خوبصورت چہرہ جس کی یاد شیریں کے دماغ میں ایک تحریر آتشیں کی طرح روشن تھی ایک پگھلے ہوئے مومی چہرے کی طرح بدرنگ ہو کر سکڑ کر پیشانی اور گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے اندر دھنسا ہوا تھا۔ اس پر نور اور صاف پیشانی کو ان روشن اور شفاف آنکھوں کو ان رنگین اور درخشاں گالوں کو گہری اور کھردری جھریاں کسی مہیب اور پرانے

درخت کی سیاہ اور بوسیدہ چھال کی طرح زندگی، روشنی اور ملائمت سے محروم ہو چکی تھیں۔ وہ صحت مند اور حسن تناسب سے معمور جسم کسی خوبصورت بت کے ابھرے ہوئے خشک سدہ چھلکے کی طرح بے گوشت و پوست ہو کر سکڑا ہوا تھا۔ وہ نرم اور نازک ہاتھ جن کا مس کسی زمانے میں عشرت احساس تھا۔ اب ابھری ہوئی بے حس اور بے خون رگوں کے جال میں جکڑی ہوئی کرخت ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ وہ مخملی بچھونوں پر آرام کرنے والا مسعود کانٹوں اور کنکروں سے لبریز زمین پر پڑا تھا وہ مانند مار پیر بگڑے والا مسعود اس بے کسی اور مجبوری کے عالم میں اس طرح پامال ہو کر اس طرح بدحال ہو کر جھر سے جھر شخص کے رحم کا انتظار کر رہا تھا اس کی دولت مندی اب ایک بکھرا ہوا خواب، اس کا حسن اب ایک اترا ہوا خمار، اس کا شباب اب ایک اجڑا ہوا سنگھار تھا۔

نسرین کی آنکھوں کے سامنے اس وقت کی یاد ایک زندہ واقعہ بن کر آ گئی۔ جب مسعود نے اپنی دولت کے نشہ سے مخمور ہو کر اپنے حسن و شباب پر مغرور ہو کر اس کو اپنے گھر سے اس طرح نکال دیا تھا جس طرح کوئی کسی آوارہ کتے کو بھی نہیں نکالتا۔ اور اس وقت اس کی آنکھیں وہ سب کچھ جو ان کے سامنے تھا نہ دیکھ سکیں۔ مگر پھر ایک چھوٹے سے چھوٹے وقفہ کے بعد اس کو یہ منظر پہلے سے زیادہ دردناک قابل رحم

اور مہیب بن کر نظر آنے لگا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔ اور اس نے ایک بھرائی ہوئی سسکیوں سے لبریز آواز میں فریاد کی۔

"آہ مسعود کیا تمہاری آخری سزا کے لئے قدرت نے مجھ کو ہی منتخب کیا تھا؟"

شیریں کی چیخ کی آواز نے بالگیروں کو چونکا دیا وہ کسی بڑے خطرے کے احساس سے، ہر غیر ضروری پاس ادب کو بالائے طاق رکھ کر، اور اپنی جھکی ہوئی گردنوں کو اور زیادہ جھکا کر اس کی طرف بلٹے۔ وحشت زدہ کوچبان جو گھوڑوں کو بے عنان چھوڑ کر نہ آسکتا تھا اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے لرز گیا۔ اور اپنی تمام ذمہ داری کو ایک رکی ہوئی سانس میں محسوس کر کے صرف یہی پوچھ سکا "مر گیا؟"

شیریں نے لالٹین زمین پر ٹیک دی۔ اور اپنی دونوں بانہوں سے مسعود کی گردن اور نسبت کو سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

آہ وہ اس طرح اپنے روٹھے ہوئے، بچھڑے ہوئے شوہر سے بغل گیر ہو! یہ آرزو کبھی شیریں کے دل میں نہ تھی۔ . . .

اس بے ہوش مسعود کو بالگیروں کی مدد سے گاڑی میں لٹا دیا۔ اور اس کے سر کو اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ شیریں کا رحم محبت اور

عفو کی آسمانی حرارت سے پگھلا ہوا دل اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر مسعود کے چہرے سے گناہ کی سیاہی کو بدی کے داغوں کو دھو رہا تھا مسعود کی بے چارگی اور بے بسی شیریں کے دل سے ماضی کے زہریلے زخموں کی یاد کو مٹا رہی تھی

تین دن تک مسعود نے نہ آنکھ کھولی نہ کروٹ بدلی۔ شہر کا بہتر سے بہتر ڈاکٹر اور لایق سے لایق حکیم اس کے معالجہ سے عاجز آ گیا۔ مگر اس وقت جب امید، مایوسی میں، روشنی، تاریکی میں، زندگی موت میں تبدیل ہوا جاہتی تھی۔ اس کے سرد اور ساکت جسم میں ایک ہلکی سی حرارت ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈاکٹر جو اپنے دل کے احساساتِ امید وبیم کو اپنی آنکھوں میں متحرک کئے، مسعود کی نبض پر ہاتھ رکھے اپنی آخری دوا کے اثر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس انتہائی کوشش کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، اپنے ہاتھوں سے محسوس کر کے چلا اٹھا "مریض بچ گیا"۔ شیریں، جو اپنے منہ کو چھپائے پلنگ کی پٹی پر سر رکھے چپ چاپ بیٹھی تھی یہ فقرہ سنتے ہی اسی طرح چادر میں لپٹی لپٹائی زمین پر گر پڑی۔ اور ایک بدحواس دلجمعی، ایک تسکین بخش بےقراری سے رو رو کر اپنی پیشانی کو زمین پر رگڑ رگڑ کر اس بے امیدی کو امید میں بدلنے والے مالک کا شکریہ ادا کرنے لگی جس کا ایک سہارا اس کو

تمام دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر چکا تھا اور جس پر مایوسی میں بھی اعتماد کرنے کی عادت اس کو مصیبت اور بیکسی کے کئی سال سکھا چکے تھے شیریں کا بوڑھا اور کمزور باپ جو پلنگ سے ذرا پرے ہٹ کر ایک آرام کرسی پر بیٹھا گردن جھکائے مختلف وظائف کا ورد کر رہا تھا ایک برقی رو کی تڑپ سے مضطرب ہوکر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک دوسری دوا جو قریب کی تپائی پر رکھی تھی مسعود کو پلائی اور پھر اس نے مسعود کو دیکھتے ہوئے اور اس کے کپڑوں کو درست کرتے کرتے کہا "اب صرف وقت کا سوال ہے۔ زندگی خطرے میں نہیں بہت جلد دماغ درستی سے کام کرنے لگے گا۔ مگر سب کچھ مریض کی باقاعدہ تیمارداری پر منحصر ہے"۔

دو ہفتہ گزر گئے مگر مسعود کی دماغی حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ اس کی عام صحت یقیناً پہلے سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ آنکھیں کھولتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مخبوط الحواس دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا جیسے وہ آوازوں کو سننے یا سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ہاتھ اٹھاتا تھا۔ اور چیزوں کو پکڑنے کی سعی کرتا تھا۔ مگر دیکھنے والے سمجھ سکتے تھے۔ کہ اس کو فاصلے کا کوئی احساس

کوئی اندازہ نہیں وہ بولتا تھا۔ مگر اس کے الفاظ میں کوئی تعلق کوئی مناسبت کوئی تسلسل نہ تھا۔

شیریں نے اس عرصے میں وہ قربانیاں کیں جو خدا کی مخلوق میں صرف ایک عورت اور عورتوں میں صرف ایک بیوی کر سکتی ہے۔ اس پر کھانا، پینا۔ سونا، آرام کرنا سب کچھ حرام ہوگیا۔ اس نے اپنی تمام زندگی کو مسعود کی ایک ایک خاطر داری میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عہد کرچکی ہے کہ یا تو مسعود کو تندرست کرلے گی یا اسی کے ساتھ خود بھی فنا ہوجائیگی۔ برسوں کی مایوسی نے، اپنے سرتاج کی تکلیف کے احساس نے، اس کی فطری ہمدردی کے وفور نے اس کی شکل میں فرشتوں کی سی معصومیت پیدا کردی۔ وہ دل بدن کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مگر یہ کمزوری اور لاغری اس کو عورت کی معنوی خوبیوں کے قریب تر لاتی جاتی تھی۔

ایک دن، بہت سے پرآلام دنوں کے بعد مسعود نے ایک غیر معمولی کرب سے آنکھ کھولی اور دیوار پر لگے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی نگاہوں پر ایک بڑا مدہ زور ڈال کر کسی کو پہچاننے کی کوشش کی اور ایک ایسی آواز میں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی ہولناک خواب سے مضطرب ہوکر بیدار ہوا ہے۔ اور جو اپنی کیفیت اظہار

ہیں زیادہ تر ایک چیخ سے مشابہ تھی چلایا "شیریں ؟" شیریں اس وقت اسی دیوار کی طرف منہ کئے پلنگ کی اس طرف بیٹھی مسعود کی ہتھیلی کو اپنے گالوں کی حرارت سے گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے لمبے اور کھلے ہوئے بال اس کے بازو پر پریشاں تھے۔ مدت کے بعد ان ہونٹوں سے اپنا نام نکلتے ہوئے سن کر شیریں نے اپنے کانوں کو جھٹلانے کے لئے اپنے دماغ کو ناقابل اعتبار سمجھنے کے لئے اپنا سر ایک ایسے ہرن کی طرح اٹھایا جو اپنے قریب کی جھاڑیوں میں سے بندوق کی گولی کے نکلنے کی سرسراہٹ سے چونک پڑتا ہے۔ مسعود نے یہ اضطراری حرکت محسوس کر کے اپنا چہرہ شیریں کی طرف پھرایا اس کے منہ سے پھر اسی کا نام نکلا "شیریں!" اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

شیریں جو آئینے کی غمازی اور مسعود کی قوت حافظہ کی بیداری سے بے خبر تھی۔ یہ محسوس کر کے کہ اس عالم بیہوشی میں بھی مسعود کے دماغ کے کسی کونے میں اس کی یاد محفوظ ہے شادمانی وحسرت کے ناقابل برداشت وفور سے دیوانی ہو گئی۔ کئی دن اور گزر گئے۔ اب مسعود کا دماغ اعتدال پر آ رہا تھا اور اس کی زندگی کی کشتی اس جانکاہ صدمے سے جس کو اس کی ذاتی ناتوانی نے اور زیادہ خطرناک بنا دیا تھا رہائی

ماکر سندرسی کے ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ شیریں اس کو ایک دفعہ پھر اپنے پہلو میں دیکھ کر، اس کو ان تمام عادات سے آزاد دیکھ کر جنہوں نے ایک زہریلے گھن کی طرح اس کی زندگی کی عمارت کو کھوکھلا کر دیا تھا مسرت و اطمینان کے آنسو بہاتی تھی۔ اور اسے پیار کر کر کے کہتی تھی "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آفت میرے حق میں اتنی بڑی رحمت ہو جائے گی"۔

ایک دن مسعود ایک گاؤتکیہ کے سہارے بیٹھا تھا اور شیریں اسے اسی طرح پیار کر کر کے خوش ہو رہی تھی کہ یک لخت مسعود نے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "شیریں! میں اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ یہ مجھے میری خوب صورت جوانی کے کھنڈر دکھا دکھا کر چھیڑتا ہے اسے ہٹا دو" شیریں تعمیل حکم کے لئے اُٹھنے کو ہی تھی کہ مسعود نے اس کا آنچل پکڑ کر پوچھا "مگر شیریں اس وقت جب کہ میری آنکھیں بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتیں جب مجھ میں ایک نام کے سوا اس مسعود کا جس کو تم جانتی تھیں ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہا۔ جب میں اپنے آپ سے اسی قدر بیگانہ ہوں جس قدر مرنے کے بعد روح ایک جسم سے ہو سکتی ہے تو صاف صاف کہو سچ سچ بتاؤ تم مجھ میں کیا دیکھتی ہو۔ ان مردہ آنکھوں، ان مرجھائے ہوئے لبوں،

اس جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے میں تم کس طرح مجھ کو پہچان سکتی ہو مجھ سے نفرت کرو۔ مجھ سے دور بھاگو۔ میرے سامنے سے ہٹو۔ تم اور فرشتہ آرہی ہو ہیں! تم اس ناپاک جسم کو پیار کرتی ہو تو کہو کیا تم مجھے اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح یہ آئینہ مجھے دیکھ رہا ہے"۔ شیریں نے اپنی باہیں مسعود کی گردن میں ڈال دیں۔ اور اپنے آنسوؤں سے تر گالوں کو اس کے پژمردہ گالوں کے ساتھ ملا کر جواب دیا۔ "مسعود بلبل بکھری ہوئی، مرجھائی ہوئی، پامال پتیوں میں بھی پھول کو پہچان لیتی ہے ان کو اپنے پھیلے ہوئے دامن میں جمع کر کے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی ہے اور انہیں وہی کھلا ہوا پھول ہی سمجھتی ہے۔ محبت حسن سے کسی زیادہ پائیدار چیز کے ساتھ وابستہ ہے تم میرے لئے اب بھی وہی مسعود ہو وہی خوب صورت، وہی نوجوان، وہی میرے مسعود جس کو میں پیار کرتی تھی"۔ مسعود نے اپنے آپ کو شیریں کی آغوش سے الگ کر کے اور شیریں کی طرف پہلے سے بہت زیادہ حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "تو پھر شیریں تم یقیناً عورت نہیں ہو کیونکہ وہ سب عورتیں جو مجھے تم سے زیادہ چاہتی تھیں کم از کم اپنی محبت کا اظہار تم سے زیادہ کرتی تھیں مجھ کو اب نہیں پہچانتیں اور جب میں ان کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ تو وہ کہتی ہیں کہ میں وہ

مسعود نہیں ہو سکتا۔ وہ مسعود خوب صورت تھا، جوان تھا، دولت مند تھا، شیریں وہ سچ کہتی ہیں میرے پاس اب ان میں سے کچھ باقی نہیں رہا پھر کوئی عورت مجھے کس طرح پہچان سکتی ہے۔ اور تم، تم کو تو مجھ سے نفرت ہونی چاہئے۔ میں ہی ہوں جس نے تمہاری زندگی کو برباد کیا مجھے پہچانو میں ہی ہوں جس نے تمہاری خوشی تمہاری حسرت تمہارا اطمینان چھین لیا۔ پھر تم مجھ سے محبت کیوں کرتی ہو۔ یقیناً تم مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہو اور اسی لئے مجھے دوبارہ زندہ کرنا چاہتی ہو۔"

شیریں نے مسعود کے ہاتھوں کو جو اس کے قلبی ہیجان سے کانپ رہے تھے اپنے ہاتھ میں لے کر اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیشانی پر گرے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ سمجھانا شروع کیا "وہ بے شک عورتیں ہیں۔ مگر مسعود ان میں سے کوئی عورت تمہاری بیوی نہیں۔ وہ صرف اسی مسعود کو جانتی تھیں جو خوب صورت تھا۔ نوجوان تھا۔ دولتمند تھا ان کے لئے تم دو مختلف شخصیتیں رکھتے تھے۔ ایک وہ جو حسن، دولت اور شباب سے مالا مال تھی۔ اور دوسری وہ جو ان چیزوں کی فنا کے بعد رہ جانے والی تھی۔ پھر اب وہ تمہیں کیوں پہچانیں جن چیزوں کو وہ پیار کرتی تھیں وہ اب فنا ہو چکی ہیں۔ مگر مسعود میرے لئے تمہاری صرف ایک شخصیت تھی جو کبھی بدل نہیں سکتی۔ کبھی فنا نہیں ہو سکتی جس

کو دلکش بنانے کے لئے کسی دولت کی ضرورت نہیں جس کو خوبصورت بنانے کے لئے کسی حسن کسی جوانی کی ضرورت نہیں جو اس وقت بھی تھی اور اب بھی جب ان چیزوں میں سے تمہارے پاس کچھ نہیں رہا موجود ہے وہ مسعود تم خود ہو۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس طرح جس طرح صرف ایک روح اپنے آپ سے محبت کرتی ہے۔

مسعود کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اس کے دماغ میں طوفان برپا ہو گیا کیا یہ سب کچھ سچ تھا کیا وہ عورت جو اس کے خیال میں صرف اس کے حسن سے محبت کرتی تھی اور جس کی محبت کو اس نے اپنے حسن کے لئے ایک ناکافی قیمت تصور کیا تھا۔ اس کے حسن اس کی جوانی اس کی دولت سے اس قدر بے نیاز تھی اور وہ تمام عورتیں . اس کے بعد وہ کچھ سوچ نہ سکا۔

اس نے اپنے سر کو سبرینا کے قدموں پر جھکا دیا۔ سبرینا نے پاؤں ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ان کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اور پھر ان پر اپنے آنسو گرا گرا کر کہا "سبرینا میں تمہارا گنہگار ہوں مجھے معاف کر دو" سبرینا اس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکی وہ رو رہی تھی اور مسعود کے سر کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لگا کر پیار کر رہی تھی۔

مسعود ایک دن باغ عامہ میں سیر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان، اس کی رفتار میں سکون، اس کی گردن میں عاجزی کا خم تھا۔

اس کے بال اب زیادہ تر سفید تھے اس کی پیشانی پر اب تجربے کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ خوبصورت اور معصوم پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ کہ اس نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی۔ اس آواز کو سنتے ہی اس کا دماغ گزرے ہوئے زمانے میں برسوں کی مسافت طے کر گیا۔ اس کے بدن نے ایک لرزہ سا محسوس کیا اور وہ اس آواز سے بھاگنے کے لئے باغ کی ایک دوسری روش کی طرف بڑھا۔ مگر اس نے ایک ایسے لہجہ میں جس کو وہ پہچانتا تھا، بہت اچھی طرح پہچانتا تھا، کسی کو اپنا نام لے کر پکارتے ہوئے سنا۔ اس نے مڑ کر دیکھا یوسف سامنے سے آرہا تھا، وہ اسی طرح جوان، اسی طرح خوش، اسی طرح بے پروا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اور خود ہی مسعود کا ہاتھ پکڑ کر اسے زور سے دباتے ہوئے کہا "مسعود مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش نہ کرو میرا شکریہ ادا کرو۔ میں نے تم پر احسان کیا ہے تمہیں ایک بھاری عذاب سے بچا لیا ہے پہلے تم معصوم تھے اب نیک ہو۔ معصومیت اور نیکی میں بڑا فرق ہے گناہ کے بغیر انسان نیک نہیں ہو سکتا۔ سنو یہی شیطان کی پیدائش کا راز ہے"۔ یہ کہہ کر اور مسعود کو اسی طرح متحیر و ششدر چھوڑ کر یوسف ساتھ کے چمن کی گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

آرام شاہ کی بیٹی

(۱)

آرام شاہ اپنے ملک کا خود مختار بادشاہ تھا خود مختاری ان معنوں میں آج ایک ناممکن چیز ہے۔ ایک بُری چیز ہے —— اس کی زبان کا لفظ ملک کے لئے قانون تھا اُس کا حکم اور اُس کے حکم کی تعمیل ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ کسی امر کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ صرف اُس کی رائے کر سکتی تھی ——

وہ دنیا کے پُرانے تاجداروں کی نسل کا ایک زندہ اور متحرک نمونہ تھا۔ وہ اپنے قد اپنے بدن اپنے حُسن ہر لحاظ سے ایک بادشاہ تھا —— اُس کا دل سنگ خارا کا ایک ٹکڑا تھا جس کو صرف محبت کے بے پروا شعلوں نے دو مرتبہ نرم کیا تھا اور دونوں مرتبہ اُس نے اس طرح محبت کی تھی جس طرح صرف ایک مضبوط اور تندرست شخص ہی کر سکتا ہے یعنی اُس نے اس نئے جذبے کے لئے اپنا دل اور تمام جذبات سے

خالی کر دیا ـــــــ وہ بادشاہ تھا۔ اور صرف فاتح یا مفتوح ہونا جانتا تھا۔

پہلی دفعہ اس کو اس عورت سے محبت ہوئی جس کو اُس نے خدا جانے کتنی اور کیسی قربانیوں کے بعد اپنی ملکہ بنایا۔ کہتے ہیں اُس وقت بہت سے بادشاہ جو آرام شاہ اور اس کی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے مایوس ہوئے۔ اور بہت سی شہزادیاں جو آرام شاہ کی جوانی اور دولت کو اپنی آئندہ ملکیت سمجھتی تھیں۔ دل پکڑ کر رہ گئیں ـــــ آرام شاہ کی ملکہ ایک غریب گڈریے کی بیٹی تھی ـــــ

شادی کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ آرام شاہ کے مشاغل میں ایک تغیر واقع ہوا اُسے اپنی سلطنت کی وسیع حدود کچھ تنگ تنگ نظر آئیں اُس نے اپنے خزانے کے مال و اسباب میں ایک ناقابل برداشت کمی محسوس کی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں اُس نے اردگرد کے علاقوں کو مسخر کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا مگر ہر روز وہ اپنے تخت کو ضرورت سے کم بلند اور اپنے تاج کو حشمت سے کم مغرور پاتا تھا۔ وہ جب وقت بیگم کے پہلو میں بیٹھتا۔ کوئی آواز اس کے کانوں میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی۔ اور وہ

چلا اٹھتا ہے بے شک یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں صرف اسی لئے بنائی گئی ہیں کہ میرے قبضے اور تصرّف میں آئیں" مگر بیگم کی ناگہانی وفات کے بعد آرام شاہ وہ آرام شاہ نہ رہا۔ اُسے اپنی زندگی کچھ زیادہ لمبی اور اپنے کاروبار بہت ہی وقت طلب دکھائی دئیے۔ بیگم کے مرتے ہی اُس نے اپنے دل کو عورت کے خیال سے خالی کر دیا۔ یہ اُس کے خیال میں مرحوم ملکہ کی محبت کا خراج تھا جو اس نے ادا کیا۔ اس نے ان تمام لطیف چیزوں کے لئے جو اس کی دولت مہیا کر سکتی تھی۔ مگر جو ایک عورت کی موجودگی کے بغیر ایک مکروہ ٹھوس اور ناجائز صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اپنے نیوں دل کو بے حس بنا لیا

دوسری دفعہ محبت نے اُس کی آنکھوں میں جو باوجود دن رات کھُلے رہنے کے تاریکی کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ دنیا کو روشن کیا وہ لمحہ تھا جس میں اُس نے اپنی اکلوتی بچی مرحوم ملکہ کی اکیلی یادگار کو اس کی عمر کے تیرھویں سال میں پہلی مرتبہ دیکھا

پیدا ہوتے ہی اُس معصوم لڑکی کو اس جنگجو اور وحشی خاندان کی رسم کے مطابق جس میں اولاد کو محض اس جرم کے لئے کہ اس کی محبت والدین کے دل سے سرد مہر کے ضروری جذبات کو چھین لیتی ہے۔ ماں باپ کے

لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اور اپنے بلند قد کو اور بلند کر کے کہا "شاید تم نے مجھے ایک غریب بے کس گڈریئے کی بیٹی سمجھ کر یہ حرأت کی ہے" اور پھر اپنی دائیں کلائی کو ایک بروقار حرکت دے کر جس سے فضا میں ایک ہلال چمک گیا۔ ایک ایسے لہجے میں جس کی لرزش شاہی سطوت کی رازداری بھی چلّا کر کہا "دیکھو اس سرزمین کے فرماں آرام شاہ کی بیٹی کو پہچانو۔ باپ نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو۔ جو بڑے بڑے سرکش پہلوانوں کا سر کاٹتے وقت بھی نہ کانپے تھے۔ بڑھا کر بھرائی ہوئی کمزور آواز میں صرف اتنا کہا "میری بچی! میں اسے تیرے کہنے سے پہلے پہچان چکا ہوں"۔ اور پھر اُسے اپنے آغوش محبت میں چھپا لیا۔

(۴)

آرام شاہ اپنے مجرموں کو سزا دینا بھول گیا۔ اپنے ظالمانہ مقصد کی تکمیل کے لئے ایک قدم نہ اُٹھا سکا وہ اب کسی کو سزا دینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی نظر میں اب کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کے لئے انسان انسان کو سزا دے سکتا ہے ـــــ کیا قدرت نے اس کے جبر و قہر کے عوض میں ایک غیر محدود محبت ایک لاانتہا رحم سے کام نہیں لیا تھا؟ ـــــ

وہ واپس آیا۔ اس کے درباریوں نے سہمی ہوئی نظریں اُٹھاکر جو بار بار اس کے خوبصورت رعب کی یاد سے جھک جاتی تھیں اور پلکوں کی چار دیواری میں پناہ لینے کے لئے بند ہو جاتی تھیں، اس کی طرف دیکھا ـــــ مگر اب اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی حلاوت اس کی پیشانی پر ایک غیر معمولی سکون، اس کے لبوں پر ایک غیر معمولی مسکراہٹ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تاریک اور بھیانک رات میں چاند نکل آیا ہے، یا ایک خشک اور بنجر بیابان قدرت کے کسی معجزے سے یکایک سرسبز و شاداب ہو گیا ہے۔

اس نے گھوڑے سے اُترتے ہی اپنے ملک اور خاندان کی روایات کے خلاف ایک ایسا حکم دیا جس کو بعض نے حیرت و استعجاب، بعض نے غصے اور نفرت، اور بعض نے مسرت و اطمینان سے سنا، اس نے اپنے ہاتھوں سے، جو اس وقت اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح کسی خوفناک آندھی کے جھونکوں سے درختوں کی نازک ٹہنیاں کانپتی ہیں، لکھ دیا کہ آئندہ کوئی بچہ اپنی ماں کی آغوش محبت اور باپ کے دامان شفقت سے جدا نہ کیا جائیگا ـــــ وہ قدرت کی اس گراں قدر نعمت کا راز سمجھ چکا تھا ـــــ

اب فریادی اس کے دربار میں، ایک اعتبار سے آنے تھے،
اب اس کا بائیں بخت جو اس سے قبل ہمیشہ ایک فوجی کیمپ کی کیفیت
اختیار کئے رکھتا تھا، ایک ہرا بھرا گلستاں نظر آتا تھا، اب اس کے
شاہی باغوں میں، اس کے محل کی آرام گاہوں میں، اس کے شہروں
کے گلی کوچوں میں، بچے بے دھڑک کھیلتے دکھائی دیتے تھے ——
یہ اصولی تغیر اس کی سلطنت کا سب سے زیادہ اہم، سب سے
زیادہ عجیب، اور سب سے زیادہ حیرت ناک واقعہ تھا۔

آرام شاہ نے ایک بڑے شاندار جلسۂ دعوت میں، جس میں
صرف ایسے لوگ مدعو کئے گئے تھے، جو صاحب اولاد تھے، اور جن
کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے بچوں کے ساتھ اس جشن میں شریک
ہوں۔ اپنی بیٹی کی سالگرہ منائی، اور اس کے لئے ایک نیا نام تجویز کیا
اس دن ایسے لوگوں نے جن کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ یا جو شادی
کرنا نہیں چاہتے تھے یا جو صاحب اولاد نہ تھے، اپنے آپ میں ایک کمی
محسوس کی۔ انسانیت کے اعتبار سے اپنے آپ کو یقینی طور پر غیر
مکمل سمجھا۔ وہ کم از کم کی ایک خاص مسرت میں حصہ لینے کے حق دار
نہ تھے۔ اس وقت ان کو ایک گھر کی ذمہ داریوں کا تردد، اہل وعیال

کی پرورش کا بارگراں اس ٹری کی کے مقابلہ پر بہت ہلکا بہت بے حقیقت اور بہت خیالی نظر آتا۔

دل آرام یہ شاہزادی کا نیا نام تھا ——— ابھی عمر کی سولھویں منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ مگر ابھی تک اس کی شادی کے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ آرام شاہ ابھی بچی کی جدائی برداشت نہ کرسکتا تھا، اس جدائی کے خیال سے بھی گھبرایا تھا۔ وہ خود کسی غیر معلوم جذبے سے مجبور ہو کر، جس کو وہ کسی سے کہنا نہ چاہتا تھا، شادی کرنے سے معذور تھا اور اس لئے اس کے برباد محل، ویران دل، اور بے چراغ سلطنت کی آبادی صرف دلارام کی ہستی پر منحصر تھی۔

ایک دن آرام شاہ اپنے پائیں باغ میں سنگ مرمر کے ایک کشادہ چبوترے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چنبیلی کی ایک نازک اور خوشبودار ٹہنی تھی، جس کے لچک دار جسم کی ضعف طاقت کو وہ اپنی مضبوط ہڈیوں پر آزما رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے، کھلے چمن میں، بہت سے بچے کھیل رہے تھے ——— وہ کسی

عمیق خیال میں مستغرق تھا۔ اس نازک خوشبودار ٹہنی کی تھپکیاں اسے اس خیال کے سحر آلود نشہ میں مدہوش کر رہی تھیں۔ ایک ٹہنی سے کھیلنے کی بے طفلانہ مصروفیت، حقیقت میں اس کے تخیل کی پرواز کے لیئے ایک تازیانہ، اس کے دماغی انہماک کے لیئے ایک بہانہ تھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر وہ اسی ایک خیال کی مختلف متحرک تصویروں کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔

یک لخت، بغیر اس لمحہ سے قبل محسوس کیئے، اس کے دماغ پر ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ اور اس نے دیکھا، کہ ان کھیلنے والے بچوں میں سے ایک ننھا سا بچہ دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا ہے۔ اور اپنی ننھی ننھی روشن اور متحرک آنکھوں کو اس کے چہرے کی طرف اُٹھائے، ایک پرامید نظر سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ آرام شاہ نے اپنے قوی اور وسیع بازو پھیلا کر اُسے اُٹھا لیا۔ اور ایک پُرکیف محبت، ایک دلی خلوص سے اپنے کشادہ اور دھڑکتے ہوئے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

بچے نے حوصلہ پاکر ایک مچلتے ہوئے انداز سے صرف اتنا کہا "یہ چھڑی ہمیں دے دو" اور کسی جواب کا انتظار کیئے بغیر، ایک جرأت سے بھری ہوئی آزادی سے، جو صرف ننھے معصوم بچوں کا ہی حق

ہے، اس چھڑی کو اُٹھا کر —— اپنی بیباک محبت اور نڈر خلوص کے اظہار کے لئے آرام شاہ کے سینے کو چوم کر اور پھر اس ملک کے قاہر فرمانروا کے زانوؤں پر پاؤں رکھ کر وہ بچہ زمین پر کودا، اور بھاگ گیا۔

آرام شاہ کی آنکھوں سے اس کے گرم رخساروں پر دو بڑے بڑے آنسو ٹپکے۔ اس کو اپنے دل کا ایک کونا خالی نظر آیا۔ اس نے اپنے سینے کے اندر ایک بیقراری محسوس کی۔ اس کے ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں اس کے سرخ خون کے ہیجان سے سرخ ہو گئیں۔ مگر اس تمام جسمانی اور روحانی کاوش کے دوران میں اس نے اپنے عقدے کا حل ہوتے لیا۔ اب اس کا دماغ اس کے تخیل کے صبر آزما آنسو سے خالی تھا اور اس کی آنکھیں اپنے سامنے، اس ہرے بھرے گلس میں، ہنستی ہوئی کھلی ہوئی، دلارام کے سوا اور کسی کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے ایک لمبی اور گہری آہ بھری اب وہ آہستہ آہستہ چبوترے کی سیڑھیوں سے اُتر کر اپنی محل سرائے کے پرسکوت دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک باپ کی ذمہ داری محسوس کر رہا ہے۔

دوسرے ہی دن شاہزادی کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

لمبے دور دراز کے شہر یاروں کے لئے دعوت کا پیغام لے کر روانہ ہوگئے۔ اس ملک میں لڑکیاں ماں باپ کی مرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی تھیں، لڑکیوں کو محض ایک جائداد کی طرح، سب سے بڑی قیمت لگانے والے کے ہاتھ بیچ نہیں دیا جاتا تھا، دوسرے لوگوں کی رائے کا معیار لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتا تھا، زندگی بھر کے شریک کے انتخاب کے لئے رسمیات کی غلامانہ پابندی نہیں کی جاتی تھی، ایک بے زبان، معصوم اور کمزور مخلوق پر ظلم کرنے کے لئے حیا اور شرم، شرافت اور غیرت کو بہانہ نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ رائے کی آزادی کو انسان کا بہترین حق سمجھا جاتا تھا، حق انتخاب کو عورت کا سب سے بڑا ورثہ تصور کیا جاتا تھا۔ تقدیر کے شکووں سے پہلے تدارک و تلاش کیا جاتا تھا، اور لڑکیوں کو اپنی زندگیوں کا مختار سمجھ کر، ان کی عقل اور پسند کو کم از کم اپنے معاملات کے انصرام کے اہل جان کر ان کی ذمہ داری کے احساس پر، ان کی قوت فیصلہ کے معیار پر اعتبار کیا جاتا تھا۔

دعوت کے پیغام اس لئے بھیجے گئے تھے کہ سب خواہشمند والیان ملک آئیں تاکہ شاہزادی کو انتخاب کا موقعہ میسر آ سکے۔ اور ان میں سے جو خوش قسمت شاہزادی کے انتخاب کی آزمایشوں میں پورا

اُترے اس کو اس کی عمر بھر کا رفیق بنا دیا جائے۔

ادھر تو یہ پیغام گئے۔ ادھر آرام شاہ نے اپنے خاص اہل کار شادی کا سامان بہم پہنچانے کی غرض سے دوڑا دئے۔

ہر اہل کار کو آرام شاہ نے اپنے خلعت کے کمرے میں بلا کر رخصت کیا۔ یہ اعزاز آرام شاہ کی سلطنت میں کسی ہی خوش نصیب کو حاصل ہوتا تھا۔ ان تمام رخصتی ملاقاتوں میں آرام شاہ اپنی ایک ہی خواہش مضطرب، ایک ہی آرزوئے بیقرار کو دہراتا تھا اور وہ یہ تھی۔ کہ دلارام کی شادی کے لئے جو سامان آئے وہ نایاب ہو۔ ان میں وہ لوگ جو شاہزادی کے خلعت عروسی کے مختلف اجزا بہم پہنچانے کے لئے گئے خاص طور پر بہت سوچ سمجھ کر منتخب کئے گئے تھے۔

آرام شاہ نے ان کو بہت التجا کے ساتھ تاکید کی۔ اس التجا میں کچھ ایسا تحکمانہ انداز تھا کہ یہ اہل کار اپنے کام کی ذمہ داری کو محسوس کر کر کے کانپ رہے تھے۔ آرام شاہ اپنے ہر ایک فقرے کو دو دو تین تین مرتبہ دہراتا تھا۔ اہل کاروں کے کان ایک نرم، حاجت مند اور عشوانانہ درخواست سن رہے تھے مگر ان کے دماغ ان کو بتا رہے تھے۔ کہ آرام شاہ کے سے خود مختار اور قاہر بادشاہ کی نرمی کو سختی

میں تبدیل ہوئے دیر نہیں ہوئی۔ ان کی آنکھوں کو اشیائے مطلوبہ کی تلاش کے لئے، دنیا بھر کی وسعت تنگ نظر آئی تھی۔ ان کے دل اس مرض کے بارگراں کے احساس سے بیٹھے جاتے تھے ان کا پچھلے دنوں کا تجربہ ان کو ایک باب کی آرزو پرور محبت کے سبق سکھا چکا تھا۔

آخر وہ دن جس کا انتظار تھا آگیا۔ دور دور کے شہزادے اور فرمانروا آرام شاہ کی بیٹی کی پسند کے سامنے اپنی ذاتی شباہت اور خاندانی وجاہت کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ شہزادی کا خلعت عروسی تیار ہو گیا۔ جہیز کا سامان آرام شاہ کے مضبوط قلعے کے تہ خانوں میں مقفل کر دیا گیا۔۔۔ آرام شاہ نے اس تمام سامان کو دیکھا، اپنی بیٹی کے ضمنی اور خوبصورت لبادے کا ایک ماہر اور باریک بین جوہری کی نظر سے مطالعہ کیا۔ اور پھر اسے بلند، قوی اور تندرست گھوڑے پر سوار ہو کر اس وسیع میدان پر نظر ڈالی جس میں ایک عورت کی محبت کو جیتنے کی کوشش کرنے والے قمار باز خیمہ زن تھے۔ اور ظاہرا طور پر بڑی بے صبری، بڑی حسرت، بڑی امید سے دوسری صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے اطمینان اور تسکین سے بھری

ہوئی ایک لمبی سانس لی۔ مگر جب اس کے بلند پرواز تخیل نے اس کے دماغ کے کان میں اتنا کہا کہ شاید ان بے شمار طالبوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے۔ جو دلارام کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر دیگا' تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر محض اس خیال سے بھاگنے کے لئے اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا اڑا' اور چشم زدن میں شاہی محل سرا کے دروازے کے اندر غائب ہوگیا۔

نصف شب گزرنے کو تھی مگر ابھی تک شہزادی اپنے غسل عروسی کی رسمیات سے فارغ نہ ہوئی تھی۔ شاہی عبادت گاہ میں اس فطرت پرست ملک کی رسم کے مطابق سب زندہ دار عابد قدرت کی طاقتوں کے ہر بڑے مظہر سے شہزادی کی آئندہ زندگی کے لئے خیر و برکت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اس معبد کے ایک گمنام کونے کے قریب آج خلاف معمول آرام شاہ بھی' اپنے سیاہ فرغل میں چھپا ہوا سربسجود پڑا تھا۔ اس کی گھنی' اور سیاہ ڈاڑھی اس کے غیر شاہی آنسوؤں سے تر تھی۔ بار بار کسی اندرونی نفاشے کے لیے جو اضطراب سے وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنی خواہشوں' اپنی آرزوؤں' اپنی حاجتوں کو محسوس کرتا

تھا۔ اس کا دماغ ان جذبات سے بھری ہوئی دعاؤں کو ترتیب دینے سے قاصر تھا۔ اس کی زبان ان بے ترتیب دعاؤں کو الفاظ میں مشکل کرنے سے عاجز تھی۔ آج پہلی دفعہ اس کو ایک اپنے سے زیادہ بڑی طاقت کا احساس ہوا تھا۔ آج اپنی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ وہ اپنی حاجتوں کو ایک اپنے سے زیادہ بڑے حاجت روا کے دربار میں پیش کرنے سے نہیں شرما یا تھا۔

اُدھر ایک سو ایک بڑی بوڑھی سہاگنیں شہزادی کو غسلِ عروسی دینے میں مصروف تھیں۔ صحت بخش جڑی بوٹیوں کے عرق، خوشبودار پھولوں کے عطر، خوش رنگ مرکبات کے غازے، مذاقِ مہذب کی حسین ترین جلوہ فرمائیوں کو موثر بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے تھے۔ شاہی حمام کے بیرونی برآمدوں میں بے شمار کم سن کنیزیں ایک رسمی نغمہ کی پیہم، دلکش، درد انگیز اور ہم آہنگ سروں سے ہوا کے ذروں کو مدہوش کر رہی تھیں۔ یہ کنیزیں جن میں سے ہر ایک، حسنِ صورت کے لحاظ سے ایک ملکہ تھی، فطرت کی بے ترتیب اور بے اصول کارفرمائیوں کی بدولت جن کو لوگ سوءِ اتفاق، بدقسمتی، یا اسی قسم کے دوسرے بے معنی ناموں سے خطاب کرتے ہیں۔ ایسے غریب ماں باپ کے گھروں میں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے اپنی غریبی

سے لڑنے کے لئے ان معصوم بچیوں کو اپنا ہتھیار بنایا۔ چاندی سونے کے چند لے حقیقت ٹکڑوں کے لئے اپنی سب سے بڑی دولت کو انسانی زندگی کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان کے نغموں میں خوشی کی جھنکار تھی۔ اس لئے کہ یہ ان کی پیاری دلارام کی جس کے لئے ان کے دلوں میں محبت کے سوا اور کوئی جذبہ نہ تھا' شادی کی تقریب تھی' مگر ہر نغمۂ مسرت کی اٹھتی ہوئی لے ایک فریاد کی دردناک دھن میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کو محسوس کر رہی تھی کہ اس کی زندگی' اس امیدوں سے بھری ہوئی رات سے خالی ہے۔ آہ انسان کی ہوس کاریوں کا جھوٹا محل کتنے انسانی حقوق کے کھنڈروں پر تعمیر کیا جاتا ہے!

آخر کار اس غسل کی لمبی اور تھکا دینے والی رسوم اختتام کو پہنچیں اور شہزادی خواصوں اور باندیوں کے عقد نر یا کے ساتھ ساتھ اپنی محلسرا کے آئینہ خانے کے دروازے تک آئی۔ یہاں رک کر سب نے پھر ایک مبارکباد کا نغمہ گایا۔ اور سات چیدہ خواصوں کے سوا' جن کے ہاتھ مشاطگی' اور آرائش کے فنون میں شہرہ آفاق تھے' سب رخصت ہو گئیں۔

شاہزادی آج پہلی دفعہ اپنی ان سات حسین' نازک اندام' اور

جاگیردار خواصوں کے ہمراہ شاہی آئینہ خانے میں داخل ہوئی۔ اس وجہ سے مگر عادت اندلس ملک کی رسم کے مطابق کنواری لڑکیوں کو ابھی شب عروسی سے پہلے آئینہ دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاکہ ان کا حسن ابھی طاقت کے نشہ سے غیر متاثر رہ کر اپنی ماہیت سے بے خبر رہ کر مردوں کی زندگیوں کو گھروں کے امن کو عصمت وحیا کی نازک دیواروں کو غارتگر حملوں سے محفوظ رکھے۔

دلارام نے اپنی آنکھوں سے آج پہلی دفعہ اپنے حسنِ بے حجاب کو دیکھا، وہ آئینوں کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی۔ گویا وہ اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی۔ ایک غیر عورت کو جسے اس نے آج تک نہ دیکھا تھا اس بے تکلف کیفیت سے اپنی طرف حیرت اور استفہام کی نظریں ڈالتے دیکھ کر وہ گھبرائی۔ اس نے جس آئینے میں دیکھا اس کو وہی ایک ہی تصویر نظر آئی۔ بے جان آئینوں کی اس جھرمٹ کو اس نے اسی تعجب، اسی غصے سے دیکھا جس سے مشتعل ہو کر ایک نادان چڑیا آئینے کے ساتھ جنگ آزما ہوتی ہے۔

آخر وہ کچھ تھک کر کچھ مایوس ہو کر کچھ سمجھ کر ایک نرم اور آرام دہ دیوان پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں اپنے سامنے کے آئینہ میں گڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا دماغ اس آئینوں کی دنیا سے الگ اپنا

کام کر رہا تھا۔

خواصوں نے، بڑی احتیاط سے، شاہزادی کا عروسی لبادہ بڑے بڑے آہنی صندوقوں سے نکالا۔ اور اس کے ایک ایک پارچے کو زریں اور جواہر نگار خوانچوں میں سجایا۔ پھر نہایت ادب و احترام سے ان خوانچوں کو شاہزادی کے سامنے قرینے سے رکھ دیا۔ سونے چاندی کے باریک تاروں سے بُنے ہوئے لباس پر دُنیا کے نایاب جواہرات کی جگمگاہٹ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی زرنار اور زرفشاں باغ میں بہار آگئی ہے۔ یا ایک درخشاں جواہرات کا خواب ہے جو کسی خورشید لقا مہ جبیں کے یکایک بیدار ہونے سے بکھر گیا ہے۔ شاہزادی نے آئینے کی گہرائی میں پہلے سے زیادہ روشنی اور چمک محسوس کی، اور جب ذرا گھبرا کر اپنی گڑی ہوئی نظر کو ہٹا کر اس نے انسانی دستکاری اور قدرتی صناعی کی مجتمع کوششوں کو اس لباس کی صورت میں جلوہ گر دیکھا۔ تو خوشی یا حیرت یا خدا جانے کس جذبے سے متاثر ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ مؤدب خواصیں یہ سمجھ کر کہ رات بھر کے جاگنے کے بعد شاید شاہزادی کو آرام کی ضرورت ہے۔ اور یہ آنکھوں کا جھپکنا اس ضرورت کا قدرتی اظہار ہے۔ چُپ چاپ دبے پاؤں پیچھے ہٹ گئیں اور بیرونی برآمدے میں دست بستہ کھڑی ہو گئیں۔

شاہزادی کے مصروف دماغ نے اس کی بند آنکھوں کے سامنے ایک نئی دُنیا کے دروازے کھول دئیے۔ وہ ہوش میں تھی، بیدار تھی، مگر اس کو اس وقت اس حقیقت بیدار کا احساس نہ تھا۔

اس نے دیکھا کہ اس کے نانا کے گاؤں میں، جس میں اس نے اپنے بچپن کا زمانہ گزارا تھا، اس کی بچپن کی سہیلیاں، اسی میدان میں جہاں وہ اپنی فطری آزادی، اور بیباکی سے کھیلا کرتی تھیں، مغموم اور اُداس بیٹھی ہیں۔ یہ بڑے شوق، بڑی محبت سے ان کی طرف بڑھی مگر اس کو دیکھتے ہی ان کے مغموم اور مُرجھائے ہوئے چہروں پر ایک سراسیمگی، ایک وحشت نمودار ہوئی معلوم ہورہا تھا کہ وہ اسے نہیں پہچانتیں۔ دلارام نے ذرا آگے بڑھ کر ان کو ان کے پیار کے ناموں سے جن سے وہ ہمیشہ ان کو خطاب کرتی تھی اور جن کو وہ اب تک نہ بھولی تھی بلایا۔ مگر اس اظہار واقفیت سے ان کی حیرانی اور پریشانی میں اور اضافہ ہوا۔ اور دلارام جس قدر آگے بڑھتی تھی۔ وہ اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ پیچھے ہٹ گئیں۔ شاہزادی نے متحیر ہو کر سوال کیا "ہائیں تم اپنی پرانی سہیلی، اپنی پیاری بہن کو اتنی جلدی بھول گئیں"

ایک آواز جس میں انتقام کا زہر ملا ہوا تھا۔ اس کے کانوں

ہیں سنائی دی "کس کی سہیلی، کسی بہن"۔

شاہزادی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "کیا محبت اس قدر جلدی نفرت سے بدل سکتی ہے"؟

وہی آواز جس سے اب ایک مصیبت زدہ عورت کی آزردگی مترشح تھی۔ پھر سنائی دی "محبت کے نام کو ناپاک نہ کرو۔ آؤ ایسی محبت کو اپنی آنکھوں سے دیکھو"۔

اتنے میں شاہزادی نے دیکھا۔ کہ اس کی پرانی سہیلیاں ایک لمبی قطار میں گاؤں کی گنجان آبادی کی طرف چل دیں۔ شاہزادی ایک مقناطیسی کشش سے مجبور ہوکر ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس نے دیکھا۔ کہ ایک تاریک اور لمبے دالان میں بہت سی عورتیں، جن کے چہروں پر غریبی اور مفلسی کے گہرے نقش نمایاں موجود تھے۔ جلدی جلدی ریشم اور اون کے ڈوروں، سونے اور چاندی کے تاروں کو ملا ملا کر مختلف کپڑے بُن رہی ہیں۔ اور جب کبھی ان کا ہاتھ سست پڑ جاتا ہے۔ یا ان کی نظر تھک کر کام کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے تو ایک قوی ہیکل حبشی غلام ان کی ننگی اور مندرنت اسخواں ملبوس بر جھڑے کا ایک کرخت کوڑا رسید کرتا ہے جس سے ان کے زرد اور بے رونق چہروں پر درد کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

اور ان کے کمزور لبوں سے ایک فریاد نکلتی ہے۔

اس دالان کے ایک کونے میں شہزادی نے ننھے ننھے دودھ پیتے بچوں کو جو سردی کی شدت سے سکڑے جا رہے تھے بلبلاتے ہوئے دیکھا۔ ان کی ماؤں کو اجازت نہ تھی کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اگر گرم کپڑوں سے نہیں تو اپنی چھاتیوں سے ہی لگا کر اپنی مامتا کی حرارت سے گرمی پہنچائیں اور ان کے سوکھے ہوئے لبوں کو اگر اس دنیا کی نعمتوں سے نہیں تو قدرت کے رات دن جاری رہنے والے سرچشمۂ حیات سے ہی تر کریں۔

شہزادی کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نہایت ہی اندوہگیں آواز سے جس کی دردناک کمزوری اس کے اپنے کانوں نے بھی محسوس کی۔ پوچھا "آخر خدا کی مخلوقات پر اتنا ظلم کیوں ہو رہا ہے اور یہ کیسے کپڑے ہیں جن کو غم اور مصیبت کے ہاتھ تیار کر رہے رہیں"۔

بہت سی آوازوں سے ملی ہوئی ایک آواز جو اپنی کیفیت میں ایک پر درد چیخ سے مشابہ تھی اس دالان میں گونج گئی "تم کون ہو کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ ہماری شاہزادی کی شادی کے کپڑے ہیں؟ تم یقیناً ہم میں سے نہیں ہو۔ شاہزادی نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں

کھول دیں۔

آئینے خانے میں بڑی بڑی قندیلیں اسی طرح روشن تھیں، آئینے اسی طرح چمک رہے تھے اور اس کی شادی کے کپڑے اسی طرح اس کے سامنے درخشاں تھے ہاں اب وہ۔ تمیز نہ کرسکی کہ آیا وہ کپڑے جو اس نے اپنے عالم خیال میں دیکھے تھے، ان کپڑوں کی مانند تھے یا یہ ان کی مانند ہیں یا دونوں ایک ہی ہیں۔

خواصیں چیخ کی آواز سن کر اندر بھاگیں۔ مگر جب تک وہ شاہزادی کے پاس پہنچیں۔ شہزادی ان بیش قیمت جواہرات سے مرصع، اُن سونے چاندی کی تاروں سے بنے ہوئے پارچات کو، ایک ایک کر کے، نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ٹھوکروں سے ٹھکرا کر دور پھینک چکی تھی۔

(۳)

ابھی صبح کا دب، خاموش اور خفیہ خبر رسانوں کی طرح رات کی تاریک سلطنت میں آفتاب عالمتاب کی سنہری فوج کی ناگہاں آمد کی خبر پہنچا کر اس کے امن و امان کو درہم برہم کیا چاہتی تھی کہ شاہی نقارچیوں نے شہناؤں اور نفریوں کے بلند مگر سریلے نغموں سے دنیا کو اس مبارک دن کی قربت کا مژدہ سنا دیا۔

شاہی مہمانوں کے خیمے، اس صبح امید کے طلوع کی خبر سنتے ہی

زندگی اور روشنی کی حرارت سے لبریز ہوگئے شاہزادی کی مسند کو سکار کرنے والے شکاری جو رات بھر اپنی گھاتوں کی سجویز اور اپنی نظر فریبیوں کو کامیاب بنانے کی تدبیروں میں نیند سے بیزار رہتے تھے، یہ پیغام بیداری سن کر ایک ہی بے چینی، ایک تازہ دم اضطراب سے بے قرار ہوگئے۔

ان میں خاور شاہ کا بیٹا ضیغم بھی، ایک دوسروں سے کم سانوار جیسے ہیں، معصم تھا۔ خاور شاہ، آرام شاہ کی ہمسایہ سلطنت کا تاج دار تھا۔ جس کی ہیبت و جبروت کا سکہ دور دور کے فرماں رواؤں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا آرام شاہ اپنی سطوت و شوکت کے باوجود اس کے علاقوں کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے گھبراتا تھا اور اگر کبھی کوئی نفر اس کی ہوس ملک گیری کے راستے میں حائل ہوا تو وہ خاور شاہ کی مہیب اور عجیب طاقت کا خوف تھا۔ خاور شاہ کا دربار شاہی شان و شوکت سے معرا تھا خاور شاہ کی سلطنت میں محبوبیت و محکومیت کا احساس ناپید تھا۔ خاور شاہ خود سادگی کا ایک زندہ پیکر تھا۔ اس کے دربار میں نہ کوئی تاج تھا نہ تخت، اس کے رہنے کے لئے نہ کوئی قصر تھا نہ محل۔ ملک کی حفاظت کے لئے اس کے پاس نہ کوئی

لشکر تھا نہ سپاہ۔ سپاہی و صعداری کے اظہار کے لئے اس کے پاس نہ کوئی درباری تھا نہ مصاحب۔ مگر جادو ایسے کیا ان تھی۔ کہ اس کی رعایا اس کی مرضی سے ادب اور عزت، محبت اور اخلاص کی مضبوط زنجیروں کے ساتھ وابستہ تھی۔ جنگ و جدال کے وقت وہ امن پسند رعایا ایک وفادار اور جنگجو لشکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتی تھی اور امن کے زمانے میں وہ سر فروش اور وحشی سپاہی ایک محنت کش اور مرنجاں مرنج آبادی کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔

اردگرد کے تاج دار جادر شاہ کو اور اس کی سلطنت کو کبھی لالچ اور حسرت سے، کبھی غصہ اور نفرت سے، کبھی تعجب اور حیرت سے دیکھتے تھے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

صنم، ان باتوں میں اپنے باپ سے دو قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ وہ ایک بے کار اور پر عشرت زندگی کے پیدائشی حقوق کے باوجود اپنے دار السلطنت سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غریب اور محنتی مزدور کی زندگی بسر کرتا تھا وہ اپنے مصارف کے لئے بیت المال سے بھیک مانگنے کو اپنے خودی کی ذلت سمجھتا تھا اپنے اقتدار کے لئے سلطنت کے کسی ممتاز منصب سے عزت کی

دریوزہ گری کو اپنے اخلاق کی توہین تصور کرتا تھا ۔ میدان جنگ میں وہ معمولی سپاہیوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑا ہو کر لڑتا کھیتوں میں معمولی کسانوں کے ساتھ دوش بدوش ہو کر کام کرتا ۔

خسرو ۔ ایک بادشاہ کا مزدور بیٹا شہزادی دلارام کے انتخاب کے معیار پر پورا اترنے کے لئے یہاں ملکہ شہزادی دلارام کو اسے انتخاب کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے آج آرام شاہ کے دارالسلطنت میں موجود تھا ۔ مگر اس کی شخصیت کا علم اس کے سوائے کسی اور فرد واحد کو نہ تھا ۔ وہ ایک پہلوان کی حیثیت سے آیا تھا ۔ اور چونکہ اس سرزمین میں جسمانی طاقت کسی امتیاز سے کم رتبہ نہ رکھتی تھی ۔ اس لئے اس کے مطالبہ پر کسی شخص کو اعتراض نہ ہوا اس نے اپنے لئے خود ہی ایک خیمہ جو عام منظر سے ذرا دور ہٹ کر ایک گوشہ میں تھا منتخب کیا ۔ اور دوران قیام میں نہ کسی سے ملا ، نہ کسی کو اپنا حسب و نسب بتایا

وہ ایک عورت کی محبت کو حسب و نسب کے امتیاز سے جیتنا نہ چاہتا تھا ، وہ اس عورت کو جسے وہ عمر بھر کے لئے رنج و راحت کا شریک بنانا چاہتا تھا موجودہ خوشحالی کا لالچ نہ دینا چاہتا تھا ، اس لئے وہ اپنے جسم کی سفارش کے لئے لعل و جواہر سے مرصع لباس ، پہن کر نہ آیا تھا ، اپنے رہنے کی نمائش کے لئے خدم و حشم کو ہمرکاب نہ لایا تھا ۔

اس کی آرزو تھی کہ وہ شادی کو ایک روحانی مقصد بننے کی اجازت نہ دے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک عورت اپنے شوہر کو صرف اس کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے انتخاب کی عزت بخشے۔ اس لئے اس نے اپنے وہی سڈول اور ورزشی جسم کو جو دن کی محنت اور رات کے آرام کی بدولت صحت و تندرستی کا ایک مجسمہ تھا۔ صرف اپنے پہاڑی علاقہ کی بھیڑوں کے سفید اور سیاہ چرمہ سے آراستہ کیا اور اس پر ایک بڑے گلدار سر کی کھال کا لبادہ پہنا۔ اس کے مضبوط کمربند میں سوائے ایک چمکتے ہوئے فولادی خنجر کے اور کوئی زیور نہ تھا۔

سورج کے نکلتے ہی سب مہمان بڑے تزک و احتشام سے شاہی میدان میں ایک زندہ، چمک دار اور متحرک ہلال کی صورت میں جمع ہو گئے۔

شہر کے متوسط اور سالوں باشندے جنہوں نے خدا جانے کن مصیبتوں سے اس رات کی لمبی گھڑیاں کاٹی تھیں، اپنی شہزادی کی شادی کی قابل یادگار رسوم کو دیکھنے کے لئے پہلے ہی سے جوق در جوق میدان کے چاروں طرف صف بستہ کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کا اپنے لئے بہترین جگہ تلاش کرنے کا شوق اور اس شوق کو پورا کرنے کی کوشش کا نظارہ، ایک طلاطم خیز سمندر کی سرکش اور

سرہیجان لہروں کی یاد دلاتا تھا۔

شاہزادی کے برآمد ہونے کا وقت ہوگیا مگر ابھی تک منتظر آنکھوں کی پیاس نہ بجھی، اس دیر نے سمند شوق پہ تازیانے کا کام کیا اور ہر شخص کی آنکھوں اور دلوں کی حرکتوں سے شہزادی کو دیکھنے کی تمنا ایک زندہ بیقراری بن کر ظاہر ہونے لگی۔

محلسرا کے دروازے کے باہر آرام شاہ خود اپنے بلند قامت ابلق گھوڑے پر سوار اپنے درباریوں اور مصاحبوں کے ساتھ شہزادی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اس کا دل ایک رہ رہ کے اُٹھنے والے درد سے سرشار تھا وہ چاہتا تھا۔ کہ اس دیر کی گھڑیاں اور لمبی ہوجائیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کو اس احساس سے خالی نہ کرسکتا تھا کہ اس کی نور نظر آج محلسرا سے نکلنے کے بعد اس حیثیت سے اس محلسرا کے دروازے کے اندر پھر کبھی داخل نہ ہوگی۔ مگر کبھی کبھی وہ اُس بے جگر اور مایوس جانباز کی طرح جو فتح اور شکست کے غیر ہم وزن مواقع کو آزمانے کے لئے دشمنوں کی شمشیر بکف صفوں میں گھس جاتا ہے، بے صبری سے خواہشمند بھی ہوجاتا تھا۔ کہ شاہزادی جلدی برآمد ہو اور جو کچھ

ہوناہے ہوجائے۔

اور کبھی کبھی جب اس کو اپنی مغرور جبلت، اپنی بیٹی کے حسن صورت و سیرت اور اس کے جہر کی بیش قیمت اہمیت کا خیال آتا تو اس کا چہرہ خوشی اور فخر سے تمتما اٹھتا۔ اور اس وہ پیرکے ناقابل فہم راز سے بیزار ہوکر اپنے قوی اور تنومند گھوڑے کے پٹھوں پر بانہیں ٹیک کر سہارا لینے کے لئے پیچھے کو جھک جانا۔

شاہزادی شہنائیوں اور نفیریوں کے شور سے بیدار ہو کر اٹھی اس کی آنکھیں خابوس زدہ آنکھوں کی طرح وحشت ناک تھیں۔ اس کا چہرہ ایک آئینہ تھا۔ جس پر اس کے دلی جذبات منعکس ہو رہے تھے اس کا دماغ اس کے جسم کی طرح بیقرار اور اس کا دل ایک غیر معلوم تڑپ سے مضطرب تھا۔

خواصوں نے ڈر ڈر کر، گھبرا گھبرا کر، سہمگیں نظروں اور مودب لفظوں سے اس صبح کی اہمیت اور مقررہ رسوم کی پابندی کی ضرورت کو جتایا۔ شہزادی اپنی قوت فیصلہ سے بیزار ہوکر کسی نامعلوم جذبے سے بے اختیار ہوکر جبیں بہ جبیں ہوگئی۔ نہ ان مودب کنیزوں کے لئے جن کی رائے کی آزادی، دوسروں کی مرضی کی پابندی کی عادی ہوچکی

تھی۔ خاموش اور راضی بہ رضا ہونے کے لئے کافی اشارہ تھا۔ وہ سر جھکائے، زبان بے زبانی سے عفو تقصیر کی التجا کئے واپس ہوگئیں۔

دلارام نے اپنے قیمتی، اور جواہر نگار لباس کو ایک بار اور ایک غائر نظر سے دیکھا۔ اور پھر کسی یاد سے بے چین ہو کر ایک خشمگین انداز سے اپنی آنکھیں ان جھلکیلے کپڑوں سے ہٹا کر بند کر لیں۔

اب اس کے چہرے پہ ایک عزم صمیم ظاہر تھا وہ اسی جگہ سے اٹھی اور چپ چاپ اپنے خلوت کے کمرے کی طرف چل دی۔ پھر بڑی احتیاط سے اس نے چمڑے کے ایک بٹوے سے ایک کنجی نکالی اور اس سے ایک مضبوط مگر پرانے آہنی صندوق کو کھولا اور اس میں سے بڑے شوق سے ایک ایک کرکے، ان کپڑوں کو نکالا۔جن کو پہنے ہوئے وہ پہلے پہل محل سرا میں داخل ہوئی تھی۔ اس میں نمبر کی کھال کا وہ جامہ بھی تھا۔جو اس دن اس کے بدن پر تھا۔جس دن آرام شاہ نے اس کو ایک پہاڑی چشمے کے پاس بھیڑیں چراتے دیکھا تھا۔

وہ ان کپڑوں کو ایک خاص تمکنت، ایک خاص ناز ایک خاص انداز سے اٹھا کر آئینہ خانے میں لائی۔ اور کسی خواص کی مدد کے بغیر انہیں پہننا شروع کر دیا۔

پوشین پوش شاہزادی نے اپنے آپ کو ایک قد آدم آئینے میں دیکھا۔ اور اطمینان و مسرت کی ایک گہری سانس لی۔ پھر خود چل کر دروازے تک آئی۔ مگر جب اس کی منتظر اور مضطرب خواصوں نے اس کے بدن پر آرام شاہ کے زرق برق خلعت عروسی کے بجائے یہ دیہاتی، جنگلی، بے حقیقت کپڑے دیکھے۔ تو وہ ششدر ہو کر رہ گئیں۔

دلارام ان کا انتظار کئے بغیر، ان کی پرحسرت و استعجاب نظروں کی طرف توجہ دئے بغیر محلسرائے کے بیرونی دروازے کی طرف چلی۔ خواصوں نے اشاروں اشاروں میں ہی ایک دوسری سے دل کے خیالات ظاہر کئے۔ اور ایک بے آواز زبان سے آرام شاہ کی بیٹی کی رائے کی مخالفت کو ایک مہلک جسارت بتا کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

شاہزادی محلسرائے کی اندرونی ڈیوڑھی پر پہنچی۔ اور نقیب نے دعائے دولت کا نعرہ بلند کیا۔ فوراً بڑے بڑے مذہبی بزرگ اور منصب دار درباری جو اس کام کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔ اس کے استقبال کے لئے اندر داخل ہوئے مگر دلارام کو ایک جنگلی، وحشی، دیہاتی لڑکی کے لباس میں دیکھ کر حسرت۔ نفرت اور غصہ سے بھر گئے ان میں سے سب سے زیادہ مشہور پارسا راہب نے جس کی دینداری ظاہری کو تسلیم

کے باوجود یہ جھجک سکی تھی بڑھ کر شاہزادی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ دیکھ کر کہ دلارام ایک شان بے پروائی سے، کسی رسمی تقریب کے بغیر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس نے بلند آواز سے جس کی گونج میں ایک زہریلے سانپ کی پھنکار ایک خونخوار بھیڑیے کے دانتوں کی کچکچاہٹ ایک مردم خوار انسان کی جواست جھلک رہی تھی کہا "آج بادشاہ کو اپنی شادی کی غلطی کا احساس ہوگا۔ ایک گڈریے کی بیٹی شہزادیاں پیدا نہیں کر سکتی"۔ دلارام، اس کی طرف نظر اٹھائے بغیر پہلے سے زیادہ بے پروائی زیادہ استغنا، زیادہ سمجھ گی سے آگے بڑھ گئی۔ اور بیرونی دروازے کی دہلیز تک جا پہنچی۔

بادشاہ نے شہزادی کو، باپ نے بیٹی کو دیکھا۔ اور پھر اس طرح جس طرح ایک مجبور، مقہور بدقسمت اپنی طبیعت کو اپنی انتہائی بدبختی کا استقبال کرنے پر رضامند کر لیتا ہے۔ اس نے اپنی پرنم نظروں کو زمین میں گاڑ کر، کسی خوشی یا شادمانی کا اظہار کئے بغیر، شاہزادی کے باگیروں کو گھوڑا بڑھانے کے لئے اشارہ کیا۔ شہزادی کسی کی مدد کا سہارا لئے بغیر اپنے سفید کلدار گھوڑے پر سوار ہوگئی۔

آرام شاہ نے اپنے گھوڑے کو مہمیز سے خفیف سی ٹھوکر لگائی گھوڑا اڑا۔ اور دم زدن میں بادشاہ اور اس کی اکلوتی بیٹی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار شاہی میدان کے مرکزی خلا میں آکر رک گئے۔

دلا رام نے، ایک عورت کی بار یک بین نظر سے اپنے طالبوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس کو سر جواہر نگار لباس، ہر ررس تاج، ہر مرصع لبادے کے نیچے ایک عیش و عشرت کی زندگی سے برباد جوانی، شاہی تزک و احتشام سے مجبور انسانیت، ظاہری نمائش سے لبریز بے سروسامانی نظر آرہی تھی۔

آرام شاہ کا دماغ بوڑھے راہب کے الفاظ کے زہر سے متاثر ہو رہا تھا زر و جواہر کی اس نظر فریب نمائش کا اپنی عزت کی ذلت اپنے ارادوں کی ناکامی، اپنے مقصد کی فنا سے مقابلہ کر رہا تھا۔ کہ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے سامنے گردہ ہوا میں ایک ہوا سے زیادہ لطیف ہستی برسے ہوئے بادلوں کی سی شفاف کیفیت اختیار کرتی ہوئی دکھائی دی کیا اس کی نظر اسے دھوکا دے رہی تھی۔ یا وہ فی الواقعہ مرحوم بیگم کو آج اتنی مدت کے بعد پھر اس کی اپنی شکل و صورت میں اسی مادی دنیا

کی فضا میں دلارام پر روشنی، امن اور برکت کے پھول برساتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر ایک غیر متوقع سکون، ایک غیر محدود اطمینان ایک غیر معلوم تبسم پیدا ہوا۔ اور اس نے دلارام کے چہرے کی طرف دیکھا۔
چمکتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے صبیح خون پر منعکس ہو کر ایک لعل و جواہر سے زیادہ درخشاں، روشنی پیدا کر رہی تھیں دلارام کے جسم کا تناسب، دلارام کے چہرے کی نمناہٹ اس کے سادہ لباس کو ایک عجیب حسن سے معمور کر رہی تھی۔ اس نے اردگرد کے شاندار منظر کو اپنی آنکھوں کے حلقوں میں محدود کیا تو اس کو دلارام اس طرح نظر آئی جس طرح ایک صبیح اور شفاف چہرے پر ایک خوبصورت خال کھلتا ہے۔

دلارام کی نظر ان زرپوش شہزادوں کے چہروں سے اچٹ کر صیغم کے صحت مند جسم، سادہ لباس، اور عریاں حسن پر پڑی۔ اس کی نظر نے رگوں کے تاروں پر دماغ کو ایک خاموش برقی پیغام پہنچایا۔ جس کی حرارت اس کے دل نے محسوس کی اس نے اپنے

گھوڑے کو اٹر لگائی۔ ان بے شمار صورت فروشوں کے دل جن کی نگاہیں شاہزادی کے فیصلہ کو ایک مادی صورت میں دیکھنے کے لئے بیقرار تھیں دھڑکے۔ مگر دلارام کا گھوڑا ان کی آراستہ صفوں سے گزرتا ہوا، سامنے کی زندہ اور متحرک دیواروں کے جگر کاٹتا ہوا ضیغم کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ شہزادی کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور وہ پھولوں کا ہار جو شہزادی کی گردن میں تھا۔ ضیغم کے کشادہ سینے سے ہم آغوش ہو گیا۔

ضیغم نے گھوڑے سے اتر کر شاہزادی کی رکاب کو پکڑا۔ اس کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور اسے اپنے مضبوط کلاوے میں لے کر گھوڑے سے اتارا۔ پھر اسنے گھوڑے کی رکاب کو تھام کر اسے اس پر سوار کیا۔ اور خود ایک جست بھر کر اس کے آگے بیٹھ گیا۔ دلارام کے خوبصورت اور خمدار بازو اس کی کمر کے ارد گرد ایک درخشاں اور لچکدار کمر بند کی طرح لپٹ گئے۔

ضیغم کا گھوڑا، کسی ناقابل دریافت حس سے اپنے مالک کے ارادے کو تاڑ کر اپنے قیمتی سرمایہ کی اہمیت کو سمجھ کر، میدان کے مرکز کی طرف، بڑی سنجیدگی، بڑی سبک روی سے بڑھا۔ اور آرام سے

کے گھوڑے کے سامنے آکر اپنے مغرور سر کو بلند کرکے اپنے
پاؤں کو ایک غیر متناہی رقص سے لرزاں کئے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

میدان میں مختلف جذبات سے بھری ہوئی آوازوں کا
ایک غیر متناسب شور پیدا ہوا۔ چند لمحوں کے بعد صرف ایک مغرورٗ
حاسدٗ اور کینہ پرور آواز جو ایک سب سے زیادہ شان دار لباس پہنے
ہوئے شہزادے کے لبوں سے نکلی تھی سنائی دی۔
"یہ بادشاہی امانت ایک بے نام و نشان وحشی پہلوان کے
سپرد نہیں کی جا سکتی۔ ایک بے وقوف لڑکی کی رائے پر ایک سلطنت
کی عزت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔
آرام شاہ کا تنومند جسم ان الفاظ کے پر نشتروں سے زخمی ہو کر
کانپا۔ مگر اس سے بیشتر کہ اس کی زبان کسی لفظ کو ترکیب دیتی اس
کے کانوں نے ضیغم کی بلند اور پر شوکت آواز کو اس کھلی فضا میں
گونجتے ہوئے سنا۔
"خادر شاہ کے بیٹے ضیغم کا حسب و نسب صرف اس خنجر کی تیز
زبان بتا سکتی ہے۔ آؤ اور اس سے پوچھو۔"
میدان میں سناٹا سا چھا گیا۔ مغرور گردنیں جھک گئیں۔ بڈھے

راہب نے اپنے سر کو فرغل میں چھپا لیا۔ خود بند معترض شہزادے کے شرمندہ چہرے نے اپنے قریب کے سوار کی بیٹھ کی پناہ لی۔

آرام شاہ کے چہرے کی ابھری ہوئی رگوں میں خوشی اور کامیابی کی رو دوڑ گئی اور پھر تماشائیوں کے قلزم میں ایک ہیجان، ایک شور پیدا ہوا۔

"خاور شاہ کا بیٹا ضیغم زندہ رہے"

شادی کی رسوم انجام کو پہنچ گئیں۔ ضیغم اور دلارام نے آرام شاہ کے دئیے ہوئے جہیز کے بے شمار اور بے بہا سامان کو دربار میں سجوایا۔ اور جب سب مہمان اور دیکھنے والے جمع ہو گئے، تو حکم دیا کہ یہ سب سامان شہر کی غریب آبادی میں تقسیم کر دیا جائے کہ ان کی محنت کی کمائی پر صرف انہی کا حق ہے۔

اس وقت آرام شاہ نے اپنے تخت سے آہستہ آہستہ اتر کر بیٹی کو گلے لگایا۔ اور پھر ضیغم اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کو یہ کہتے ہوئے تخت پر بٹھا دیا۔

"لو اس وسیع سلطنت کی رعایا کے حقوق کی پاسبانی تم سنبھالو کہ یہ تمہارا حق ہے۔"

اندھا دیوتا

(۱)

اسلم لاہور کے ایک مشہور سوداگر کا بیٹا تھا۔ اس کے والد نے
اپنے باپ دادا سے کوئی دولت ورثہ میں نہ پائی تھی جو کچھ کمایا اسے
دست و بازو کی ہمت اور دماغ کی ذہانت کی بدولت جو کچھ بچایا اپنی
ان تھک کوششوں اور کفایت شعار زندگی کے باعث۔ اسلم کی ماں
جوان عمر میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اسلم ابھی بچہ تھا اس
کے والد نے اپنی نیک دل اور حسرت نصیب بیوی کی یاد کو ہمیشہ تازہ
رکھنے اور اس کو ایک سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کے لئے
پھر شادی نہ کی۔

اسلم ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے والد
کے منشا کے مطابق قانون پڑھنے کے لئے لاہور لاء کالج میں داخل
ہوگیا۔ پہلے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ابھی دوسرے سال

کی تعلیم شروع ہی کی تھی۔ کہ اتا بک تخت بیمار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ اسلم کو اپنے والد کی ناگہاں موت سے بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے بے سروسامان چھوڑ کر چل بسے تھے۔ کیونکہ حساب کتاب کی پڑتال کے بعد اس پر اپنے والد کی کفایت شعار زندگی کا نتیجہ کھلا۔ بنک کے پاس کوئی، چھتر ہزار روپیہ کے بعد پونڈ تھے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے مختلف بنکوں میں جمع کئے۔ اور پچاس ہزار کی مالیت کی ہنڈیاں تجوری میں محفوظ تھیں۔ شہر میں دو عظیم الشان مکان اور سول لائن میں چھ بنگلے تھے جن کے کرایہ کی آمدنی پونے چار سو روپے ماہوار تھی کل ماہوار آمدنی کا حساب کیا گیا تو ساڑھے بارہ ہزار کا تخمینہ ہوا اسلم کو والد کی موت کا صدمہ اس لئے ہوا۔ کہ اس کا اس دنیا میں اپنے والد کے سوا اور کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی والدہ ایک غریب گھرانے کی یتیم اور قریباً لاوارث لڑکی تھی۔ اور اس کے والد کے تمام قریبی رشتہ دار یکے بعد دیگرے راہیٔ بقا ہو چکے تھے۔ اب اس بھری دنیا میں وہ باوجود اپنی دولت اور لیاقت کے بالکل اکیلا تھا۔ شکل و صورت۔ وضع و تراش عادات و خیالات کے لحاظ سے اسلم ایک قابلِ رشک انسان تھا جس طرف جاتا لوگوں کی انگلیاں اُٹھ جاتیں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے انگریزی وضع کے کپڑے اس کے ذرا لمبے بال، اس کی مستانہ چال میں ایک خاص

ادا پیدا کر دیتے تھے اس کے شفاف چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں عجب حسن پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ اس کے لبوں پر ایک عرفانی مسکراہٹ ہمیشہ ایک کھلے ہوئے حسن کی بہار کا سماں دیتی تھی مگر اس کشادہ سینے کی تہوں کے نیچے ایک یاس انگیز اور درد رسیدہ دل تھا اسلم دولت و عزّت کی سرشاری میں بھی کبھی خوش نہ رہتا تھا۔ اس کے دوست اس سے ملنے آتے۔ وہ ان کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھتا مگر ہر دوست قریبًا قریبًا یہی محسوس کرتا چلا جاتا۔ کہ اسلم خوش نہیں۔ آخر اس کے دوستوں میں خصوصًا اور واقفوں میں عمومًا اس بات کا چرچا ہونے لگا۔ کہ میاں اسلم کا دل کسی غیر معلوم غم کے بار گراں سے دبا رہتا ہے ــــــ

والد کی موجودگی اسلم کے لئے ایک طلسم تھا۔ جو ان کی وفات کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اس نے اپنی زندگی میں ایک خاص کمی محسوس کی۔ اور اس کو اپنا گھر خالی خالی سا نظر آیا۔ نوکر چاکر گاڑی گھوڑا سب کچھ موجود تھا۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا جس کو وہ اپنے دل کی باتیں سناتا یا جس کا خیال اس کو کام کرنے کے وقت یا آرام کی ساعتوں میں بے چین کرتا۔

اسلم فطری طور پر فلسفی مزاج تھا۔ اس پر چار پانچ سال کی فلسفہ

کی تعلیم اور دن رات کی محنت نے اس فلسفے کو ایک خاص روشن عمل بخش دی تھی۔ اور وہ بڑی کامیابی سے ہر عقدہ کا حل سوچ لیتا تھا۔ چنانچہ اس لے اس اضطرار۔ اس اُداسی اور اس کمی کے احساس کا مطالعہ کیا۔ اور اس عقدہ کو حل کرنا چاہا۔

اس نے خیال کیا کہ اس کے لئے ایک محرم راز کی ضرورت ہے۔ جو اس کی خوشی سے خوش ہو۔ اور اس کے غم سے مغموم۔ جو اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرے۔ اس کے منجمد دل کو محبت کے شعلوں سے نرم کرے۔ اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر اس کی زندگی کو ایک حقیقی لطف سے بہرہ اندوز کرے۔ ظاہر تھا کہ ایک ہمدرد عورت کے سوا اس کے دل میں یہ کیفیت کوئی اور ہستی پیدا نہ کر سکتی تھی

مگر آہ یہ ایک بہت ٹیڑھا سوال تھا۔ کیا اسلم چار سال سے اس سوال کے بلاخیز گرداب میں غوطے نہیں کھا رہا تھا؟ اس نے کتنی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا اور ان سے سبق حاصل کیا کتنی کتابیں فلسفہ ازدواج کے متعلق پڑھیں اور ان کو آہ سرد بھر بھر کر ختم کیا۔ یہی سوال اسلم کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت۔ اس کا حسن اس کی وجاہت، حسین سے حسین صورت کو خرید سکتی ہے۔ مگر آہ اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ تمام دولت، محبت کی ایک

جھلک نہیں خرید سکتی۔ وہ حسن صورت اور شرافت طبعی کو صرف محبت کے زیور سمجھتا تھا اس کے نزدیک حقیقی حسن محبت میں تھا۔ صورت و سیرت کی خوبیاں محبت کے لئے ایسی تھیں۔ جیسے ایک پتھر کے حسین بُت کو آراستہ کر دیا جائے۔ یا ایک محسن و نیک سیرت عورت کا دِل نکال لیا جائے۔

چار سال سے وہ اسی تلاش میں تھا۔ ایک بار بمبئی گیا۔ اور وہاں مختلف عورتوں کے چہروں میں اس محبت کو تلاش کرنا چاہا۔ ہاں۔ محبت کے متعلق اسلم کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ جذبہ بالکل فوری، اضطراری اور بے اختیاری ہے۔ اور ایک نظر میں ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت جو آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ یا جو صرف اس لئے پیدا ہو جائے کہ ایک انسان کسی کی زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ محبت نہیں پسند ہے۔ لوگ لین دین اور محبت میں اسی قدر دھوکا کھاتے ہیں۔ جس قدر دوستی اور محبت میں، یا پرستش اور عزت میں۔

اسی طرح جہاں جہاں وہ جا سکا گیا۔ جس جس چہرہ تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی۔ وہ پہنچا۔ کیونکہ صحبت یا گفتگو کسی چہرے سے اسے واسطہ

نہ تھا وہ محبت کو پہلی نظر کی تیر شعاعوں میں ڈھونڈتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے دل کو اسی کمبخت مارو میں دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور پھر وہ ایک گہری اور سرد آہ بھر کر سگرٹ پینے لگ جاتا۔

سگرٹ اس نے اسی دن سے پینا شروع کیا تھا جس دن سے یہ اُمنگ اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی آرزوئے ناکام اپنی حسرت کسی اور داغ ناتمام سے مٹانا چاہتی تھی۔ سگرٹ اس مصروفیت کے لئے بہترین بہانہ تھا۔ اس لئے اب جب کہ اس کے دل کی حسرت پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سگرٹ ہی اس کے دل کا کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ اپنا بہت سا وقت سگرٹ پینے میں ہی صرف کرتا تھا کسی خاص نشہ کی مجبوری یا عادت کے تقاضے سے نہیں۔ بلکہ محض اس طرح جیسے ایک بچہ کسی خاص دلکش کھلونے سے کھیلتا ہے۔

اب اس آرزو کے شعلے اسے دن بھر بیقرار رکھتے تھے۔ وہ رات بھر اپنی آئندہ صبح کا دستورالعمل تیار کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر صبح اس کی ناکامی کی قبر پر آنسو بہا کر پردۂ عدم میں چھپ جاتی تھی۔

دوست، جن سے اسے کبھی محبت نہ تھی۔ اب اسے بُرے معلوم ہونے تھے۔ عیش و آرام بغیر ایک شریک کی شرکت کے ڈراؤنا نظر آتا تھا۔

زندگی بے معنی دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کی محنت پر آنسو بہاتا تھا۔ آئندہ شاید اس کا سب سے زیادہ مہلک دشمن تھا۔ اس کی صحبت سے وہ حتی المقدور بھاگتا تھا۔

ایک سب اس کا دل سیاہ رات کی طرح بے چراغ تھا۔ امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا ہر روز کی مایوسیوں نے بجھا دیا تھا اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک دستور العمل سوچ رہا تھا۔ مگر ہر دستور العمل تاریک تھا۔ بیکار تھا . آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کے جہاز کو ڈوبنے سے قبل ایک بار پھر بچانے کی کوشش کرے گا اس سے پیشتر کہ محبت کے امکان کی امید کو وہ ہمیشہ کے لئے دل سے مٹا دے۔ اس کے لئے ایک دفعہ سب سے بڑا موقعہ تلاش کرے گا۔ اس کے دل کی امید و بیم کی وہی کیفیت تھی۔ جو ایک ایسے بوڑھے دولتمند کے دل کی ہو جو اپنی عمر بھر کی کمائی کے لئے ایک جائز وارث کی نہ پوری ہونے والی تمنا سے دل کو حرارت دیتا رہتا ہے۔

اسلم نے تہیہ کر لیا کہ وہ یورپ کا ایک دورہ کرے گا کسی تعلیمی یا تجارتی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف محبت کی تلاش میں، اس زندہ متحرک بت کی تلاش میں جو اس سے محبت کر سکے اور اس کی پرستش

کے قائل ہو کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں سوائے چند محدود جگہوں کے حسن اور محبت کے نظارے میسر نہیں آ سکتے ہندوستان کی بہترین دولت مقفل گھروں اور نہ برنہ بردوں میں مقید ہے۔

یورپ میں شاید حسن اپنی بیباک کیفیت بے حجابی میں، اس کے منجمد دل کو پگھلا دے۔ اس کی بیقرار آنکھیں شاید اس خیالی آرزو کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ پائیں۔

وہ یورپ گیا۔ اور تین سال تک یورپ کے کونے کونے کی خاک چھان ماری لیکن شاہد آرزو کسی سراب خیالی کے نظر فریب دھوکوں کی طرح اور دور ہوتا چلا گیا۔ مگر اُف اس کی پیاس، اس تعاقب اور گرم روی سے اس شوق اور حسرت کی تلخکامی اور تپش سے تیز ہوتی گئی۔

وہ واپس آیا۔ مگر اب اسلم وہ اسلم نہ تھا۔ وفور درد کے اُس احساس کُش اثر کی طرح جو کسی بیمار کو آرام اور درد دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اس ناکامیٔ تمنا نے اس کو آرام اور تکلیف، محبت اور نفرت، زندگی اور موت کے تاثرات سے آزاد کر دیا تھا۔

اب وہ اس دُنیا کی مادیت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو اسی ذات میں فنا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اب شہر سے دُور ایک خوبصورت بنگلہ بنایا۔ اسے بہترین سامان آرائش سے سجایا۔ مگر زیادہ تر اس کا وقت اپنے کتب خانے میں گزرتا۔ جسے اس نے ہر نایاب اور قابل دید کتاب سے بھر دیا تھا۔ ہاں اس کے گھر بھر میں کوئی تصویر نہ تھی۔ وہ تصویروں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ زندہ انسانوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کی جن میں سے کوئی بھی . . . . . آہ . . اس کے لئے . . . نہ تھی . .

(۲)

ایک شام کو اسلم اپنے کتب خانہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا، کہ شاید کسی چیز کو کبھی نہ بھولنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے بھلا دینے کی کوشش کی جائے، کیونکہ وہ خیال جس کو بھلانے کے لئے وہ اس قدر محنت، دولت اور وقت صرف کر رہا تھا، دن بہ دن، ساعت بہ ساعت، زیادہ تیزی کے ساتھ دلنشین ہو رہا تھا۔

وہ آج صبح ہی سے اپنے کتب خانے میں تھا، اور ایک ایسے قمار باز کی طرح، جو روز روز کی ہار سے مایوس ہوکر اپنی تمام باقی ماندہ دولت ایک ہی

باری پر لگانے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس نے آج یہ فیصلہ کیا تھا، کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے دریافت کرے گا، کہ محبت کی کوئی ہستی بھی ہے، کہ نہیں۔

کتابیں جو مضمون، زبان اور طرزِ ادا کے اعتبار سے مختلف تھیں چاروں طرف کھلی پڑی تھیں، وہ کبھی ایک کو الٹا کر پڑھتا کبھی دوسری کو دیکھتا، کبھی ان سے باتیں کرتا اور پھر خود بخود ہی ہنس دیتا، یہ معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی نادانی پر ہنس رہا ہے، یا ان کتابوں کی ناکامیابی پر۔ وہ گویا ایک شرابی تھا جو اردگرد کی تمام چیزوں کو مدہوش سمجھتا ہے اور ان سے بے حجابانہ دست درازی کرتا ہے۔

اب اس کی صاف پیشانی پر غصہ کی جھلک دکھائی دی، اس کی آنکھوں میں کسی اندرونی صدمے سے آنسو بھر آئے، اس نے بڑے زور سے اس کتاب کو جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ زمین پر پٹک دیا اور چلّا اٹھا "سب جھوٹ، سب دھوکا ہے" یہ صرف انسان کو بے وقوف بنانے کی تدبیریں ہیں"۔

اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک سگریٹ جل رہا تھا، اور وہ اس کی سوزش کے اثرات سے بالکل بے خبر تھا، وہ اٹھا اس کے چہرے سے تھکن، اس کی آنکھوں سے مایوسی اور اس کی حرکات

سے صاف ظاہر تھی، اب اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا، معلوم ہوتا تھا، کہ اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح متحرک اور مصروف ہے۔

اس نے ایک اور سگریٹ جلایا، اور دیا سلائی کی جگہ سگریٹ کو پھینک کر دیا سلائی کو ہونٹوں سے لگائے پھر خود ہی اس حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر ہنسا، اب وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے دیوار میں نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا تھا، اور اپنے خیالات کو خود ہی سننے کے لئے الفاظ میں متشکل کر رہا تھا۔

"بس اسی طرح جیسے میں نے اس جلتے ہوئے سگریٹ کو پھینک کر ایک بجھی ہوئی بیکار دیا سلائی کو پینا شروع کر دیا، لوگ اس مفید اور کارآمد دنیا کے مشاغل کو چھوڑ کر، ایک بے معنی خیال، ایک بے حقیقت ہستی کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں، . محبت نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے، بلکہ ایک جھوٹ ہے، جسے انسان عادتاً بولتا ہے، ایک فریب ہے جس میں بیکار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں، ایک مرض ہے جو وقتاً وقتاً کمزور دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے ."

آہ غریب اسلم! شاید تجھے معلوم نہیں کہ محبت کی مخالفت اس کی سب سے بڑی طاقت ہے، اور شاید اس وقت جب تو اس قدر شد و مد سے اس کی ہستی سے انکار کرنا چاہتا ہے، محبت کا تیر اندازد لوٹتا تیرے دل

کو للچائی ہوئی نظروں سے تاک رہا ہے۔

وہ بہکی بہکی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، وہ دماغ کو کسی اور خیال میں مصروف کرنا چاہتا تھا، مگر اس کوشش کی ناکامیابی اس کی آنکھوں کے اضطرار سے ظاہر تھی، یک لخت اس نے ایک جست بھری، میز کے قریب آیا اور ایک گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا۔
اس کے چہرے پر اب تسکین تھی، گویا اس نے ایک بڑے عقدے کو حل کر لیا ـــ

ایک مختصر صورت ملازم داخل ہوا، اور سرکار کہہ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا، اسلم نے کچھ نہ سنا، اور پھر بہت زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا، وہ ایک بچے کی طرح اپنے خیال سے کھیل رہا تھا، ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر اور ذرا بلند آواز سے یاد دلایا۔

'میں حاضر ہوں سرکار'۔

اسلم نے بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا، اور ابھی ملازم دو قدم ہی چلا ہوگا کہ زور سے پکارا، 'جلدی بہت جلدی'۔
وہ ایک لحظہ بھر بھی اس کمرے میں نہ رہنا چاہتا تھا، اس آواز نے

ملازم کی موت معلوم ہوا ایک برقی اثر کیا، اور وہ بھاگا ابھی دو منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ بالکل بیقرار ہوگیا — وہ حیران تھا کہ گاڑی کے تیار کرنے کے لئے دو مکمل دنوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے — وہ وقت کا ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہا تھا، اسے آج وقت آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا، وہ بے صبری سے باہر نکلا، اور گاڑی کو اسے دروازے کے سامنے نہ دیکھ کر آج پہلی مرتبہ سائس کو اس کے کام کی اہمیت اور وقت کی قیمت بتانے کے لئے اصطبل کی طرف چلا — وہ صرف وقت گزارنا چاہتا تھا —

اصطبل کے دروازے پر پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی اس کو توقع تھی کہ وہ سائیس کو حقہ پیتے ہوئے، ملازم کو باتیں کرتے ہوئے اور گھوڑے کو ابھی تھان پہ بندھے ہوئے پائے گا، مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا، سب کے سب ایک غیر معمولی دلچسپی اور تیزی سے گاڑی تیار کرنے میں مصروف تھے — سائیس کی لڑکی دھنیا بھی ایک جھاڑن سے گاڑی صاف کر رہی تھی — وہ اپنے حکم کی تعمیل کو ایک عملی شکل میں دیکھ کر خوش ہوا، اسے اپنے لفظ کی اہمیت کا احساس ہوا، خدا کے اتنے بندے اس کی مرضی کو پورا کرنے کے لئے اپنی قوتیں صرف کر رہے تھے، وہ دو چار قدم آگے بڑھ گیا، اب اس کی آنکھیں صرف ایک حرکت کو اپنے

محدود حلقوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، اس کا دماغ صرف ایک حرکت کو سمجھنے کی فکر میں تھا، یہ حرکت ایک نازک، سانولے، چاندی کے کنگن والے ہاتھ کی تھی، جو گاڑی کو صاف کرنے میں مصروف تھا، وَھنیا کی پشت اسلم کی طرف تھی ——— وہ صرف ایک بلند، سڈول، اور صحت مند جسم کی ضخامت کو دیکھ سکتا تھا، اور صرف اس سانولے ہاتھ کو، جو برابر ادھر سے اُدھر حرکت کر رہا تھا،

اسلم کا پاؤں ایک اینٹ سے جو راستہ میں پڑی تھی، رکا، ایک آہٹ پیدا ہوئی، اور وہ سب لوگ جو گاڑی کو تیار کر رہے تھے، ادھر متوجہ ہوئے

. . .

مگر اسلم کچھ دیکھ نہ سکا، اس کی آنکھوں نے پہلے کسی دور و دراز پہاڑ پر چمکنے والی بجلی کو دیکھا، پھر ایک پُر ساتت کی چڑھی ہوئی ندی کی رفتار کا اندازہ کیا، اور پھر اس کے لئے دنیا تاریک ہو گئی ———

وَھنیا، اپنے آقا کو دیکھتے ہی شرما چکی تھی، اور جھاڑن کو پھینک کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگ کر غائب ہو چکی تھی ———

اسلم کچھ سمجھ نہ سکا، سائیس گاڑی کو دروازے پر لایا، اسلم چپ چاپ سوار ہو گیا، سائیس حکم کا منتظر تھا، اسلم ذرا گھبرا کر چونکا، اور چلو کہہ کر پھر خاموش ہو گیا، گاڑی چلی، اسلم نے ایک جذبۂ بے اختیار سے مڑ کر اضطرال

کی طرف دیکھا، اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی قیمتی چیز بھول گیا ہے یا اس مجموعہ میں جس کا نام اسلم ہے کسی اہم سر کی کمی واقع ہو گئی ہے وہ اس چیز کو یاد کرنے کے لئے دماغ پر زور دے رہا تھا،

ابھی گاڑی نے مشکل سے کوئی دس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اسلم نے سائیس کو واپس ہونے کا حکم دیا، شریر چالاک اور تندرست گھوڑا اس قدر جلد واپس کئے جانے پر بھڑکا، بوڑھے سائیں نے اپنے کمزور ہاتھوں کی طاقت کے اظہار کے لئے گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا، گھوڑا ایک ایسے مغرور اور باہمت شخص کی طرح جو اپنی بے بسی کی حالت میں ذرا سی ہتکی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھ کر بگڑتا ہے، بگڑا اور تین چار ایسی زندیں بھریں، کہ گاڑی اصطبل کے دروازے کے سامنے آکر الٹ گئی سائیس نے گرتے ہی ایک چیخ ماری، گاڑی کے الٹنے کی آواز گھوڑے کے بیقرار شور اور سائیس کی چیخ کو سن کر نوکر چاکر اصطبل اور کوٹھی سے بھاگے، ان میں دَصبا، بھی تھی،

سائیس کو کوئی چوٹ نہ آئی تھی، مگر اسلم گاڑی سے کوئی سات قدم پرے گر کر بیہوش ہو چکا تھا، ہمدردی اور غمگساری کے اس فطری تقاضے سے مجبور ہو کر جو عورت کو مرد کے لئے ایک لازوال نعمت بنا دیتا ہے۔ دَصبا، اسلم کی طرف دوڑی اور پھر کچھ سمجھ کر پلٹی، ساتھ ہی کے نل

سے پانی کا ایک چلو بھر کر لائی اور اس سے اس کے مردہ کو زندہ کر دیا، کیا وہ
سحر اور سمندر کا عمر تجھ کو کر سکتا، ایک عورت سامنے آئی اس نے ہلکا سا
سا دوپٹہ، اور چاندی کے کنگنوں والے ہاتھوں سے اسلم کے چہرے پر
پانی کے دو چھینٹے دئے

اسلم نے ذرا تڑپ کر آنکھیں جھپکیں، اور پھر ٹکٹکی لگا کر اس صورت کو جو اب ابھی پوری شان بے حجابی سے اس کے سامنے کھڑی دیکھنے لگا، وصنا نے پانی کے بے شمار قطروں کو جو موتیوں کی طرح اسلم کے چہرے پر ڈھلک رہے تھے اپنے آنچل سے صاف کر دیا

وصنا، سائنس کی بیٹی تھی، مگر عورت تھی، عورت اپنے فرض کی ادائگی میں وقت موقع اور محل کی تلاش نہیں کرتی، جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں ایک مسیحائی اثر ہے اس کا ذرا سا اشارہ، اس کا خفیف سا سہارا، برسوں کی تکلیف، اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے ٹوٹے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا عارضی علاج صرف عورت ہی ہے -

---

وہ اپنا فرض ادا کرنے کے بعد چلی اسلم کی پرنم آنکھیں جن میں احسان مندی اور شکر گزاری کی ایک لہر موجزن تھی ایک لمحہ اور جھکے ہوئے مگر اداس سا بیماری کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں

اور اسلم کے سمجھدار دماغ سے لے کر اس کے بھولے سادہ دل پر ایک اندھا سا جذبہ اپنی سرافرازی کی مشق کر رہا تھا۔

(۱۲)

آج اسلم اپنی کوٹھی کے بہت بڑے کمرے میں ایک خوبصورت اور آرام دہ صوفے پر ایک رنگین تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر سکون تھا، وہ سکون، جو کسی لمبی اور تکلیف دہ بیماری کے بعد چہرے پر ظاہر ہوتا ہے، وہ سکون، جو ایک خوفناک طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر چھا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہر عضو آرام اور اطمینان سے مزے لے رہا ہے، یہ بہت بڑا کمرہ کوٹھی کا سب سے زیادہ شاندار اور آراستہ کمرہ تھا مگر اسلم [illegible] دوسری [illegible] کی ایک ہی کمی جو ہر قسم کی تصویروں کی غیر موجودگی سے ہر دیکھنے والے کو محسوس ہوا کرتی تھی، اب پوری کر دی گئی تھی، اس تصویر میں ایک انتقامی ولولے کے ساتھ ہر دوسری آرائش کو پیچھے [illegible] ڈال رہی تھیں، وہ تصویریں جن کو اسلم نے کھلے [illegible] میں اس

ذوق وشوق سے حریدا تھا، کہ گویا یہی ایک کام اس کی زندگی کا منشاء و مقصد ہے۔

اسلم کی نظروں کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی یہ انسانی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی، اس کے نیچے روشن حروف میں فتح حسن لکھا تھا، یہ تصویر ایک حسین عورت کی تھی، جو ایک متکبرانہ انداز سے ایک خوشنما درخت کی ڈال کے ساتھ جھکی ہوئی کھڑی ہے، درخت کے ارد گرد خوبصورت پرندے تھے، جو ظاہرا طور پر اس کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دے کو تالِ زندگی تصور کئے ہوئے ہیں، اِدھر اُدھر کے گھنے جنگلوں سے وحشی درندے پرستارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، سامنے کے روشن دان سے کبھی کبھی ایک عجیب پراسرار روشنی اس تصویر پر منعکس ہوتی تھی، جس سے اس بے جان تصویر میں زندگی کی حرارت پیدا ہو ہو کر رہ جاتی تھی

کمرے کے دائیں کونے میں ایک ہاتھی دانت کی مرصع اور خوشنما تپائی پر ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ رکھا تھا، جو ابھی ابھی خواب نوشیں سے بیدار ہو کر انگڑائی لے رہی ہے، دونوں بانہیں ایک ذرا پیچھے کی طرف جھکے ہوئے سر کے اوپر اس خوبصورت ست کا محراب بن گئی تھیں،

کھلے ہوئے سیاہ اور لمبے بالوں نے چہرے کے ایک حصّہ کو چھپا رکھا تھا، اس کے نیچے اسی طرح روشن حروف میں 'فتنہ بیدار' لکھا تھا۔

اسلم کے بائیں پہلو کے قریب ایک آبنوس کے خوبصورت مگر بڑے ستان کے ساتھ ایک اور تصویر رکھی تھی جو 'بارگاہ عشق' کے نام سے موسوم تھی، اس میں عشق کا دیوتا، حور پیکر پری جمالوں کے عقد ثریا میں گھرا ہوا ایک پھولوں کے تخت پر جلوہ افروز تھا، ایک خوبصورت مگر سرکش حسین لڑکی کو زنجیروں میں مقیّد کرکے اس کے حضور میں لا رہے تھے، جسے دیکھ کر وہ اپنا پھولوں کا ترکش سنبھال رہا تھا۔

اسلم ان سب تصویروں کو یوں دیکھ رہا تھا، گویا وہ کسی بے ہوش کرنے والی شراب کے دریا ہیں، اور اس کی پیاسی آنکھیں تہیّہ کر چکی ہیں کہ آج ان دریاؤں کو سکھا دیا جائے گا، مگر وہ کبھی کبھی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ جاتا کیونکہ جس کسی تصویر کو وہ دیکھتا تھا، اس کی شکل و صورت میں آہستہ آہستہ ایک تغیر شروع ہو جاتا تھا، کچھ وقفے کے بعد اس کی آنکھوں کو 'دھنیا' کے سوا اور کوئی تصویر نظر نہ آتی تھی۔

ہفتہ بھر اس کی یہی حالت رہی تھی، یعنی اس وقت سے جب اس نے 'دھنیا' کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس ہفتہ کا ایک ایک دن اس ایک

ایک دن کی ایک ایک ساعت اس کے لئے ایک مسرت، تبسم ایک تبسم لازوال بن گئی تھی، جس حسن کو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، جس جذبہ کو وہ محسوس کرنا چاہتا تھا، اب اس کے دل میں تھا، اب ہر ایک چیز اس کے لئے ایک معنی رکھتی تھی، اب اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف ہو گئی تھی، اب اس نے عورت کی سدا بس کا راز معلوم کر لیا تھا۔

اس ہفتہ کے سات دن اس کے لئے سات سال ہو گئے تھے ان سات دنوں میں دھنیا کے متعلق کوئی سات ہزار تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں، سب سے پہلے اس کے دماغ میں وہی خیال آیا، جو ہر معمولی مرد کے دماغ میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آسکتا ہے، اس نے اس پر ایک بے جان جان دار کی طرح ملکیت کا قبضہ حاصل کرنے کی تجویز کی، اس کی قیمت لگائی، مگر ہر قیمت اس کے حسن کو خریدنے کے لئے کم تھی، پھر اس خیال کو ایک ناپاک، نازیبا، اور بالکل عامیانہ سمجھ کر چھوڑ دیا ——— پھر اس نے شادی کرنے کی تجویز کی، مگر آہ ———

دھنیا کے مذہب کا تعصب، دھنیا کی قوم کی عصبیت، دھنیا کی ذات کی دیوار اس کے ارادے اور اس کی تکمیل کے درمیان حائل تھی، وہ جانتا تھا کہ دھنیا کی غریب اور محنت کش برادری کسی قسم کے بیرونی دخل کو اپنی

انتہائی ذلت تصور کرتی ہے — وہ اپنے مقدمات کو عدالت کے دروازوں تک لے جانے سے احتراز کرتی ہے — اس وقت اُسے محسوس ہوا، کہ انسان نے انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے کس قدر جوانمت سے کام لیا ہے وہ گھبرا گیا، مگر اس نے ایک پوری رات کی نہ ختم ہونے والی گھڑیوں میں ٹہل ٹہل کر اس مسئلہ کو حل کر لیا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام انسانوں اور اُن کے قاعدوں سے ایک بہتر روش اختیار کرے گا۔

اس کی روح تکالیف کو برداشت کر کر کے جسمانی آلائشوں سے پاک ہو چکی تھی، وہ سوچ رہا تھا، اور اپنے کمرے کی ساکن، اور خاموش دیوار کو کچھ سمجھا رہا تھا، جس چیز سے محبت کی جائے، وہ یقیناً خوبصورت ہوتی ہے خوبصورت اور محبوب چیز کو مقدس سمجھنا چاہئے، مقدس چیز کی عزت کی جاتی ہے، پرستش کی جاتی ہے، مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے، دور سے دیکھتے ہیں، شاید ان کو آنکھوں سے دیکھنا بھی خلاف ادب ہے، عاشق و معشوق میں بُعدِ مکانی ضروری ہے، تاکہ وہ روحانی تسلسل، وہ برقی ارتباط، جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے، قائم ہو سکے، چھونے سے مقدس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے۔ ان کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبت مقام پرستش کی ایک منزل ہے، مقدس اشیا سے مادی مفاد کی امید درست نہیں کیا

ایک مفید اور کارآمد جبر سے بھی محبّت کی جا سکتی ہے ؟ تعجب ہے کہ لوگ ان عورتوں کو جن سے وہ محبت کرتے ہیں، اپنی بیویاں بنانا چاہتے ہیں" وہ بڑے زور سے ہنسا' لوگوں کی جہالت پر' اس عام خیال کی بیہودگی پر' اور پھر اپنی کامیابی پر خوش ہوا' وہ اپنی بند آنکھوں میں ایک نئی دنیا کو دیکھ رہا تھا'

اس واقعہ کے بعد دو تین روز اور گزر گئے تھے اور آج وہ اتنا خوش تھا' کہ اُسے اپنی مسرت پر خود حیرت ہو رہی تھی' اور اس لئے وہ آج ارادتاً اس آراستہ کمرے میں اپنی خوشی کو خود محسوس کرنے کے لئے بیٹھا تھا'

اس نے خلاف معمول نوکر کو آواز دی' وہ زبان سے ہمیشہ بہت کم کام لیا کرتا تھا' ملازم حاضر ہوا' تو اس نے دھنیا کے باپ کو بلانے کا حکم دیا' ملازم حیران ہوا' کہ آج سائیں کو اس کے اپنے نام کی بجائے اس رشتہ سے کیوں یاد کیا گیا ہے' لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ ایک سَر لب گھرانے کا مؤدّب نوکر تھا ——

دھنیا کا باپ آیا' اسلم نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی' اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو روشن تھے' اس کے زرد اور پراطمینان چہرے

پر ایک سرخی کی رَو دوڑ رہی تھی، اور وہ اپنے گالوں کی گرمی کو اپنے
ذہن میں محسوس کر رہا تھا،
اُس نے کچھ رک رک کر، کچھ سوچ سوچ کر آخر کار کہا،
"تم نے دَھنیا کی (ا ہم) شادی
اب تک کیوں نہیں کی"۔
سائیں اس خلاف توقع اہانت سے گھبرایا، اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی،
"حضور کوئی دو چار پیسے ہوتے ہیں، تو شادی بھی کر دی جائے گی، منگنی تو
ہو چکی ہے"۔
اسلم کے دل میں ایک غیر محدود مسرت کا طوفان اٹھا، وہ دَھنیا کے
اس عظیم الشان احسان کا بدلہ اتار سکتا تھا۔ ایک لڑکی کو ایک کامیاب
عورت بنانے کے راستے میں صرف سونے چاندی کے چند سکے حائل
تھے ——— اس نے ذرا جلدی جلدی کہنا شروع کیا،
"دیکھو رام علی، تمہاری بیٹی نے ہماری جان بچائی"۔ وہ صرف اس کام
کو کرنے کے لئے جسے وہ کرنا چاہتا تھا، ایک بہانہ کی تلاش میں تھا، وہ
خوب جانتا تھا پانی کے دو چھینٹے دینے کے سوا دَھنیا نے اور کچھ نہیں
کیا تھا ———
"اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ناممکن ہے"۔

بیچارہ سائس کچھ نہ سمجھا' اس نے صرف اتنا ہی کہا'

"وہ آپ کی لونڈی ہے"

اسلم اس جواب کو سننے کے لئے تیار نہ تھا' وہ جلدی میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا'

"وہ لونڈی نہیں ملکہ ہے' وہ عورت ہے' وہ مرد کی قسمت ہے' وہ بھگتی کی دیوی ہے' وہ احسان کی مجسم تصویر ہے' ______

تم نے کیا کہا لونڈی ہے   تم نے گناہ کیا ہے' توبہ کرو'

وہ عورت ہے وہ ماں ہوسکتی ہے' وہ بہن ہوسکتی ہے' وہ بیٹی ہو سکتی ہے' وہ بیوی ہوسکتی ہے' مگر لونڈی کبھی نہیں ہوسکتی

تم اس کے باپ ہو' اس لئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں"

اسلم کے دل کی حرارت کو کون سمجھ سکتا تھا' جس احساس کو محسوس کرنے کے لئے' اس نے اپنی عمر کی بہترین ساعتیں بے کار صرف کی تھیں' جس جذبہ کی زندہ تصویر دیکھنے کے لئے اس کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام ہوگئی تھی' اس احساس کو' اس جذبے کو' اس نے دھنیا کے ہاتھ کی ایک حرکت میں دیکھ لیا تھا' اس کی ایک نظر میں محسوس کرلیا تھا'

دھنیا اس کے لئے صرف ایک پرستش کے قابل چیز تھی' وہ

اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کرچکا تھا، اور جس کام کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کرچکا تھا، اسے کرنا چاہتا تھا، اس لیے اسے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک لفافہ نکالا، اس میں بینک کی ایک کتاب اور ایک مکان کا قبالہ تھا، اس نے ایک ایسے عقیدت مند پجاری کی طرح جو پھولوں کا ایک حقیر ہار اپنے دیوتا کے قدموں پر نچھاور کرتا ہے اس لفافہ کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑھے سائیں کی طرف بڑھایا، اور کہا، "لو، یہ میری طرف سے دھنیا کو دے دو، یاد رکھو، یہ اس کے احسان کا عوض نہیں، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا، اس کو میں ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کے نام، پچاس ہزار روپے بنک میں جمع کرا دئے گئے ہیں، یہ اس کے حساب کی کتاب ہے، اور یہ اس سامنے والی کوٹھی کا قبالہ ہے آج سے وہ کوٹھی میری نہیں دھنیا کی ہے"

سائیں مبہوت تھا، اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، وہ گرنا چاہتا تھا، اس کا دماغ اس کے کانوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا، اس لیے سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر اس سے پیشتر کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکتا، اسلم نے ذرا زور سے چلّا کر کہا، "ایک لفظ نہیں، ایک حرف نہیں، میں شکریہ نہیں چاہتا، جاؤ"۔

سائیں ایک بے جان مگر متحرک بت کی طرح دروازے کی طرف حرکت کر رہا تھا' وہ نظروں سے غائب ہو گیا' اسلم ایک عجیب انداز سے اٹھا' اس کے چہرے پر آسمانی نور کی ایک جھلک سی تھی' اس کے لبوں پر تبسم تھا' اس کی آنکھیں کسی اندرونی روشنی سے چمک رہی تھیں' اور اُس کو وہ اطمینان قلب' وہ روحانی تسکین' وہ جسمانی آرام میسر تھا جو صرف ایک نیک دل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد ہی میسر آ سکتا ہے۔



گناہ کی رات

(۱)

ممتاز اپنے دفتر کے خوبصورت اور آراستہ کمرے میں، ایک نرم نازک اور بیش قیمت صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ، جس میں ایک جلتا ہوا سگریٹ تھا صوفے کے دائیں بازو کی بلندی پر سہارا لئے ہوئے تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ، جس کی درمیانی انگلی میں ایک ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی درخشاں تھی۔ بار بار اس کی پیشانی سے اوپر کی طرف حرکت کرتا اور رہ رہ کے اس کے لمبے اور گھنے بالوں میں چھپ جاتا تھا اس کی آنکھیں سامنے کی دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دیوار میں کوئی مقناطیسی کشش ہے جو اس کی نگاہ کو ہٹنے نہیں دیتی اس کا جسم بظاہر آرام و اطمینان کے مزے لے رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ ایک مسلسل، ایک مرتعش، ایک متحرک خیال کے ساتھ ساتھ بے قرار تھا۔

وہ شریف تھا ذہین تھا عقل مند تھا۔ مگر اس وقت وہ آسرات

کی یاد میں محو تھا۔ جس رات کو اس کی شرافت ایک مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئی تھی۔ جس رات اس کا ذہن ایک خاص نقطۂ خیال کے ارد گرد گھومنے کے سوا، اور ہر ادراک سے قاصر ہو گیا تھا۔ جس رات اس کی عقل خلاف معمول اس بات کے حق میں رائے دے رہی تھی۔ جس کو وہ اس رات سے پہلے، نامناسب مکروہ اور ناجائز خیال کرتا تھا۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آہ! وہ رات تھی یا دنیا بھر کے طلسموں کا ایک زندہ مظاہرہ، جس کی ایک ایک ساعت کے ایک ایک غیر ممکن التقسیم حصے کے ساتھ اس کی امید، اس کی حسرت، اس کی خوشی کی یاد وابستہ تھی۔ اس نے اس رات اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ موسیقی کو ایک زندہ عورت کی شکل میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا جس کے نغمے کی ہر اٹھتی ہوئی لے ہوا کے ذروں کو حسین بنا رہی تھی۔ اس نے اس رات ایک عورت کے پاؤں کی حرکت کو ایک شعر کی کیفیت اختیار کرتے دیکھا تھا جس سے بے جان زمین میں جان پیدا ہو گئی تھی۔

وہ رات ممتاز کے لئے ایک عجیب رات تھی۔ اس رات جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اس کا ذہن نہ سمجھ سکتا تھا۔ جو کچھ اس کا ذہن محسوس کر رہا تھا اس کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھیں۔

ایک عورت۔ ایک بے باک کیفیت سے حمائی ہیں انسانی جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دلوں میں امیدیں پیدا کرکے ان کو ایک جسمکس دیوی کی طرح پامال کر رہی تھیں۔ اسی رات کو اس نے دیکھا کہ پارساؤں کی پارسائی، عقل مندوں کی عقل، ایک عورت کے ناروا انداز کی قربان گاہ پر مجروح ہوگئی اسی رات کو اس نے مرد کی کمزوری عورت کی طاقت صبر کی بزدلی اور اخلاق کی شکست کا مشاہدہ کیا۔

رات گو دنیا کے لئے وقت کی غیر محدود مسافت میں ایک معمولی منزل طے کر کے ختم ہوگئی مگر ممتاز کے لئے یہ ایک کبھی ختم ہونے والی رات تھی اس وقت بھی وہ اس رات کو اپنے دماغ میں اپنی آنکھوں میں محسوس کر رہا تھا اس کی زندگی کا دورہ اس اسی رات تک بل کر رک جاتا تھا۔ اس کی یاد۔ اس رات کے سوا اور تمام واقعات کو فراموش کر چکی تھی

اس رات کو گزرے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ اس ایک مہینے میں اس نے دن رات کی ان تھک کوششوں۔ دولت کے اندھا دھند صرف اور اپنے ہمدردوں کے دماغ کی لگاتار کاوشوں سے اس خوبصورت رقاصہ کے گھر تک رسائی حاصل کی۔ آہ جس گھر کے

دروازے ہر دوسرے شخص کے لئے دن رات کھلے رہتے تھے ایک شرفِن دماغ کی عیاری سے ممتاز کے لئے بند ہو گئے تھے حُسن نے عشق کی چنگاری کو ایک روح سوز شعلے میں مشتعل کرنے کے لئے اپنا پرانا۔ مجرب اور کامیاب نسخہ استعمال کیا تھا۔

ہر کوشش کی ناکامیابی ہر امید کی ناکامی نے ممتاز کو پہلے سے زیادہ شائق کر دیا۔ آخرکار اس وقت جب زندگی اور موت صرف ایک اقرار یا انکار پر منحصر تھی۔ عقل اور جنون صرف ایک ہاں اور نا کے درمیان پناہ ڈھونڈھ رہا تھا اس کی فریاد سنی گئی۔ اس کی کوششیں بارور ہوئیں ہاں اس نے اس وقت دولت کی طاقت کو محسوس کیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس قدر دولت مند تھا۔

اس کے بعد اس کی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ عود کر آئی اس کو دنیا پھر ہنستی ہوئی نظر آئی اس کو زندگی پھر جینے کے قابل معلوم ہوئی مگر آخرکار اس کا سارا کاروبار ایک مسلسل بے توجہی سے بگڑ گیا۔ اس کے بوڑھے باپ۔ اس کی پیار کرنے والی بیوی۔ اس کی معصوم بہن کے دل کا آرام اجڑ گیا۔ اب اس کا وقت زیادہ تر اسے دفتر کے کمرے میں گزرتا تھا جو اس کے گھر سے دور ایک پُرفضا مقام پر واقع تھا۔

وہ جب کبھی گھر جاتا۔ تو اس طرح جیسے کوئی اجنبی زیادہ سے زیادہ ایک عارضی مہماں کی حیثیت سے کسی غیر کے مکاں پر گھڑی دو گھڑی وقت گزارنے کے لئے جاتا ہے۔ اس کے ضعیف باپ پر فالج گرا۔ وہ ایک دفعہ اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔ مگر جب اس نے ایک نقاہت آزردگی اور افسردگی سے بھری ہوئی آواز کو اس رقاصہ کے خلاف نصیحت کرتے ہوئے سنا جو اس کی انتہائی حسرتوں کا آخری مقصد تھی تو وہ بیزار ہو گیا۔ جب ایک پرانے ملازم نے جس نے ممتاز کو گود میں کھلایا تھا اس کے کانوں تک ڈرتے ڈرتے یہ اطلاع پہنچائی کہ اس کی بیوی دن رات رو رو کر اپنے حسن، اپنی جوانی، اپنی زندگی کو ایک قبل از وقت موت کی آغوش میں بسر کر رہی ہے تو اس نے ایک تحقیر آمیز تمسخر سے قہقہہ لگایا اور اپنی آزادی کو ایسی کمزور زنجیروں میں پابند نہ پا کر بڑی مسرت، بڑی طمانیت کا اظہار کیا۔

ممتاز نے سگریٹ کو ایک آخری کش لے کر پھینک دیا اور دائیں ہاتھ سے ایک تپائی پر سے جو صوفے کے قریب بائیں طرف رکھی تھی۔ ایک گلاس اٹھایا۔ اس میں زعفرانی رنگ کی شراب برف اور سوڈے کے پُر جوش بخارات سے دست و گریباں ہو رہی تھی۔ اس نے اس گلاس

کو کسی مدت کے پیاسے کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر بغیر رُکے۔ بغیر سوچے
سمجھے مُنہ میں اُلٹا اور حلق سے اتار دیا۔ گویا وہ اتنا بے صبر تھا کہ کام و
زبان کی وساطت کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ خدا جانے اس آبِ آتشین
نے اس کے اندرونی نظام پر کیا اثر کیا کہ اس کی پیاس بُجھنے کی جگہ بھڑک گئی
اور اس نے پے در پے گلاس کو بھرنا اور اسی طرح خالی کرنا شروع کر دیا۔

اب میز پر ایک خالی بوتل نظر آ رہی تھی اور ایک بھرا ہوا گلاس جو
اس بوتل کا آخری سرمایہ تھا اس کے ہاتھ میں تھا مگر اب اس کے
ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ اس کی آنکھ کے سُرخ ڈورے
آگ کی روشن تحریریں بن کر پتلیوں کی سطح سے اُبھرے اُبھرے دکھائی دیتے
تھے۔ اس کی سانس میں ایک غیر معمولی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ بے شمار جلے
ہوئے سگرٹوں کا ایک انبار اس کے خاکستر داں میں جمع ہو گیا تھا وہ اٹھا
اور بجلی کے پنکھے کی کارگزاری سے غیر مطمئن ہو کر اس کی رفتار میں اور
زیادہ تیزی پیدا کرنے کے لئے دیوار پر لگے ہوئے میٹر کی طرف بڑھا وہ
اٹھنے کو تو اٹھ چکا تھا مگر اس کے پاؤں کی لغزش اس کی عصبی کمزوری
کا پتہ دے رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر رکھی ہوئی کرسیوں، تپائیوں اور الماریوں
کا سہارا لے کر اسی نشست تک پہنچنے کے لئے چلا۔ مگر اس سے پیشتر

کہ وہ اس جگہ تک پہنچے اس کی آنکھ ایک قدآدم آئینہ پر رُکی جو اس کمرے کے آتش دان کی دیوار کے ساتھ آویزاں تھا۔

اس نے ذرا بڑھ کر اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنے آپ کو پہچاننے میں ضرورت سے دراز یا دہ دیر لگائی وہ سنبھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی جد و جہد اپنی آنکھوں کو آئینہ کی شفاف سطح کے کسی ایک مرکز پر جمانے کی سعی میں سرگرم تھی۔ وہ اپنے دماغ کو آئینہ میں اپنے عکس کی موجودگی کا یقین دلانے پر اصرار کر رہا تھا پھر جب اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو اس کے چہرے پر ایک مغرور فاتح کی سی، ایک حسین عورت کی سی طمانیت بخش مسرت ظاہر ہوئی۔
آج اس نے اپنے لباس کے مختلف اجزا کو ایک پورا دن صرف کر کے منتخب کیا تھا۔ اور اس وقت اپنے جسم کے تناسب پر اس دل بھر کی محنت کو بارور ہوتے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی گردن پھرائی اور شراب کی خالی بوتل کو دیکھا۔ پھر آئینہ کی طرف متوجہ ہوا ۵۰ اس چیز کو جس سے بوتل خالی ہو چکی تھی اپنی آنکھوں کے عکس کی گہرائی میں تلاش کر رہا تھا اس گم گشتہ سیلاب آتش کو اپنی آنکھوں میں ایک زندہ کیفیت میں موجزن پا کر اس نے اطمینان۔ امید زندگی کی ایک سانس لی

اور پھر اسی حرکت کو اپنی سمت کی طرف جاری رکھتے ہوئے معمول سے زیادہ زور سے اسے ملازم کو آواز دی۔

ملازم بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور ابھی اس نے مشکل سے "جی سرکار" کہا ہی تھا کہ ممتاز نے اس کو موٹر تیار کرنے کے لئے حکم دیا ابھی ملازم نے پیٹھ ہی پھیرائی تھی کہ اس پر جلدی بہت جلدی" کا تحکمانہ تازیانہ پڑا جس کام کے لئے وہ آج صبح سے تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کو تکمیل تک پہنچانے کا وقت آ پہنچا تھا اس کے سامنے گوشدانی پر رکھا ہوا کلاک آٹھ بجا رہا تھا۔ اور اب وہ ذرا سی دیر کا متحمل نہ ہو سکتا تھا آہ یہ وقت۔ یہ رات۔ اسے کسی محسوں کتنی کاوشوں، کتنی حسرتوں کے بعد میسر آئی تھی۔ اس نے اس رات کو اپنے موعودہ وقت سے پہلے لانے کے لئے کتنی پر اضطراب، پر آرزو اور پر آلام کوششیں کی تھیں۔ آج کے سورج کو اپنے ہی دوران حیات میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا شوق اس کی زندگی کے کتنے دنوں کو تاریک سے تاریک رات سے زیادہ تاریک بنا چکا تھا۔

یہ وہی رات تھی جس کی آرزو کی خاکستر میں ہزاروں عشاق دفن ہو گئے۔

یہ وہی رات تھی جس کے حصول کی تمنا عشق کی ریت کا موجب ہوتی ہے۔ یہ وہی رات تھی۔ جس کا شوق کڑی سے کڑی منزل کو آن واحد میں طے اور مشکل سے مشکل مہم کو ایک اشارے میں سر کرا دیتا ہے یہ وہی رات تھی جس کی اسید زندگی کی تلخیوں کو شیریں۔ درد ہجر کی مصیبتوں کو خوبصورت شوق کی ناکامیوں کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ یہ وہی رات تھی جو خداوندی قانون کی پابندیوں کے ساتھ۔ قدرت کا بہترین تحفہ۔ ایک عورت اور مرد کی محبت کا خوشترین ثمر۔ ارتباط جسمانی کا اعلیٰ ترین معراج ہے۔ یہ وہی رات تھی جو حکم جوار کے بغیر شیطان کا سب سے عجیب آلہ اخلاقی ذلت کی سب سے اسفل گہرائی۔ عورت اور مرد کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

آج ممتاز اسی محبت کے زندہ اور متحرک بت کو اپنے پہلو میں محسوس کرنے۔ اپنے شوق کے سکبیے قرار کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس جذبے کو تکمیل تک پہنچانے جا رہا تھا جس نے اس کی نظر میں دنیا کے سب سے بڑے گناہ کو ثواب۔ سب سے بڑی برائی کو ایک نیکی سب سے بڑی اخلاقی کمزوری کو ایک اخلاقی جرأت کر دکھایا تھا۔

(۲)

وہ موٹر کے انتظار میں اپنے محلی دیوان پر جس کو اس نے ترکی وضع

کی تقلید میں اپنے کمرے کی سب سے حسین زینت بنا رکھا تھا لیٹ گیا۔ اب وہ اس ٹہری کشمکش کے بعد جس سے وہ تھک گیا تھا۔ ذرا آرام کرنا چاہتا تھا۔ یہ چند لمحوں کی فرصت غنیمت تھی۔ اس نے اپنے پاؤں سامنے کی کرسی پر رکھ کے اپنے سر کو ایک نرم اور ریشمیں دار مخمل کے گاؤ تکیے کا سہارا دیا رونے کے بعد بچّہ بہت جلد سو جاتا ہے۔ جسمانی درد کے بعد دماغ بہت جلد تسکین پاتا ہے۔ طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر غیر معمولی سکون نظر آتا ہے۔ اس کا دماغ بہت سی تکلیفوں سے تھک چکا تھا اس کا جسم آج دن بھر کی محنت سے تنگ آچکا تھا اس کے اعصاب شراب کے جوش اور حدت سے اپنی انتہائی کشاکش کر چکے تھے اس نے اس وقت یہ دیوان معمول سے زیادہ آرام دہ۔ گاؤ تکیہ ضرورت سے زیادہ نرم۔ یہ چند لمحے بہت سے دنوں سے زیادہ کارآمد محسوس کئے وہ اپنی آنکھیں بند کرکے دل ہی دل میں دیوان۔ گاؤ تکیہ اور مخمل کے ایجاد کرنے والے دماغوں کی ذہانت کی تعریف کر رہا تھا اس ملازم کی سستی کو جسے ہوشیار کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا کچھ زیادہ معیوب۔ سمجھنے کے لئے بہانے سوچ رہا تھا۔

اتنے میں اس نے ملازم کو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا

اور اس کے کانوں نے "سرکار موٹر تیار ہے" کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے سے باہر نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ اس نے محسوس تک نہ کیا کہ اس کے سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں لکڑی ہے یا نہیں یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ کیونکہ آج تک ان دو چیزوں کے بغیر وہ کبھی گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ اس کو اس امر کا احساس ضرور ہوا کہ شاید آج وہ ملازم کو اسے سامنے سے ہٹا لیے یا سد دروازے کو کھولے کے بغیر ان میں سے گزر گیا۔ آج ہر ایک چیز نے کچھ ایسی شفاف آبی بخارات کی سی لطیف کیفیت اختیار کر لی تھی۔

موٹر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ مگر آج خدا جانے کیا بات تھی کہ وقت اور فاصلہ اپنے فطری خواص کے استعمال سے عاجز تھا وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ کب چلا اور کب پہنچا۔ یا یہ راستہ کیسے طے ہوا۔ اس کو موٹر پر بیٹھنے اور پھر موٹر سے اترنے کے سوا اور کچھ یاد نہ رہا۔ کیا ان دونوں حرکتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا کچھ وقت صرف نہ ہوا تھا۔ یا اس کا دماغ اس وقت فاصلہ اور وقت کی سی کثافت اور مادی اشیاء کے نقوش کو اخذ کرنے سے قاصر تھا؟

وہ موٹر سے اترا۔ اور ایک بہت سی روشنیوں سے روشن بازار میں تھوڑی

دور چل کر ایک خوبصورت، بلند اور وسیع مکان کے دروازے پر رُکا۔ وہ دروازے کے اندر پاؤں رکھنے ہی کو تھا کہ کسی آواز نے جو اس کے دماغ سے یا دل سے یا جسم کے ہر روئیں روئیں سے نکلی۔ اس کے متحرک جسم کو ایک لمحہ کے لئے ساکن کر دیا۔ انسان کی فطری نیکی نے اپنی موت سے پہلے زندگی کے لئے آخری کشمکش کی۔ اخلاق نے اپنے وقار کی حفاظت کے لئے آخری تدبیر کی۔ حواس نے اپنی صحت کا آخری ثبوت دیا۔ ضمیر نے اس رشتہ کو ٹوٹتے دیکھ کر جو بیچارے کی گردن کو مالک کی مرضی کے ساتھ وابستہ رکھتا تھا۔ اس کو بچانے کے لئے آخری جدوجہد کی۔ مجروح شرافت نے آخری سانس لی۔ وضعداری سربازار بے شمار دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ذلیل ہو کر تڑپی۔ اس کے نظام عصبی نے۔ اس کے قوائے جسمانی نے ایک زلزلہ محسوس کیا۔ اس کے دماغ کی سلطنت میں بغاوت ہو گئی۔ مختار نے سب کچھ دیکھا سب کچھ سنا اور پھر اپنی آنکھوں پر خواہشوں کی پٹی باندھ کر، اپنے کانوں میں ہوس کا پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر، اپنے ضمیر کا گناہ کے آہنی پنجہ سے گلا گھونٹ کر، ایک جست بھری۔ اور اس برقی روشنی سے روشن۔ موسیقی کے نغموں سے لبریز۔ حسن کے کرشموں سے مسحور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

اس مکان کی مسرور درخشاں فضا میں ایک برقی روشنی سے زیادہ روشن بجلی چمکی ممتاز کی آنکھیں چندھیا گئیں اس نے اپنے آپ کو یک لخت کسی بڑے تصادم سے رکتے ہوئے پایا اور اس کے زور اور رعب سے مرعوب ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھلتے ہوئے محسوس کیا

ایک حسن سے زیادہ حسین، نور سے زیادہ منور خوشبو سے زیادہ معطر چہرہ اس کے حسرت مندلبوں کے قریب ایک خطرناک قربت پر آ کے رُک گیا تھا۔ سفید رنگ کے نازک۔ شفاف اور نرم ریشم کی باریک سہ بیں سے جھلملاتے ہوئے دو بازو جن پر سیاہ اور سنہری رنگ کی آمیزش سے بکھرے ہوئے لمبے اور پُر پیچ بال بکھرا رہے تھے اس کی آغوش میں اُلجھ گئے تھے۔ اور دو روشن، بڑی اور نیم وا آنکھیں مُسکرا مُسکرا کر اس کی آنکھوں سے ایک خاموش مگر عام فہم زباں میں کچھ ایسی باتیں کر رہی تھیں جن کو اس کا دل سن سن کر سمجھ سمجھ کر، مسرور ہو رہا تھا۔

انہی آنکھوں کے پُر کیف جاذبے سے کھنچ کر، انہی بازوؤں کے اُلجھے ہوئے جال میں پھنس کر، انہی بالوں کی کشش سے متاثر ہو کر، وہ ایک کمرے میں جس کے کھلے ہوئے دروازے درمیانی صحن کے دائیں کونے میں لاکھوں دلربائیوں کے جادو جگا کر ہر تشنہ لب ارمان کو تکمیل حسرت کی دعوت دے رہے تھے پہنچ گیا

اس رات کے بعد کئی راتیں آئیں اور گزر گئیں کئی دن پیدا ہو ہو کر شکم عدم میں چھپ گئے۔ دن مہینوں میں۔ مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے بچے جوان۔ جوان بوڑھے ہو گئے۔

زمانے کے ساتھ اہل زمانہ کے خیالات۔ وقت کے ساتھ لوگوں کی صفات تبدیل ہو گئیں۔ پیدا ہو ہو کے فنا ہونے والی فنا ہو ہو کے زندہ ہونے والی دنیا کے ساتھ سلسلہ حیات و ممات بدل گیا۔ مگر ممتاز کے جذبات میں کوئی تبدیلی۔ کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ اسی طرح اس ساحرہ کے سحر سے مسحور۔ اس قاہرہ کے حکم سے محصور ہو کر اپنی جوانی۔ اپنی صحت اپنی دولت حسن و ناز کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھاتا رہا۔

اس عرصہ میں ایسا زمانہ بھی آیا۔ جب ممتاز نے دنوں تک۔ مہینوں تک اس مکان کی اندرونی دنیا کے سوائے بیرونی دنیا کی کسی چیز کو نہ دیکھا۔ کیا اس نے ساری دنیا کا ماحصل اس محدود چار دیواری کے اندر حاصل کر لیا تھا۔ یا دنیا نے اس کو اپنی وسیع نعمتوں کے خلاف بغاوت کرنے دیکھ کر اس زندان میں محبوس کر دیا تھا۔

اس تمام عرصہ میں وہ اگر سوتا تو صرف اس لئے کہ وہ غارت گر دین و ایمان اس کو خواب میں نظر آئے۔ اگر بیدار ہوتا تو محض اس لئے کہ اس بیداد گر کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشق ستم کرتے دیکھے۔ جب وہ کسی

بات پر بگڑ جاتی تو وہ اپنے دل کی حسرتوں کو اپنی جوانی کے ولولوں کو اپنی زندگی کی امیدوں کو آنسو کے ایک قطرے میں محو کر کے اس کے قدموں پر گرا دیتا جب وہ من جاتی تو اپنے شوق کو اپنے اضطراب کو اپنی خود فراموش عقیدت کو اپنے سر کی ایک جنبش میں مشکل کر کے اس کے پاؤں پر نچھاور کر دیتا۔

ایک شب وہ اس حسن فروش کی آغوش میں بے خبر پڑا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کی ناگہانی موت کی خبر سنی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کو حسن نے مرنے والی کے جائز حق کو ایک جابر مالک کی طرح غصب کر لیا تھا۔ فاتحانہ مسرت سے مسرور دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

ایک دن جب وہ اس مکان کی ہر پابندی سے بے پروا آزادی سے بیزار ہو کر اس عورت کے لئے، جس پر اب وہ ایک واحد مالک کی حیثیت سے قبضہ کرنے کا متمنی تھا، جس کو اب وہ اپنے سوا کسی اور کی آنکھوں سے دیکھا جانا بھی پسند نہ کرتا تھا ایک علیحدہ عشرت منزل بنانے کی فکر میں تھا۔ اس کے لئے بہت سے نقشوں پر جو اس کے دماغ کے منظر گاہ پر باری باری منقش ہو ہو کر محو ہو جانے تھے غور کر رہا تھا اور ان نقشوں کی تکمیل کے لئے اپنے محاصل کو ناکافی پا کر خیال ہی خیال میں اپنے باپ کی جمع کی

ہوئی دولت کو ایک خود غرض لالچی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے ایک سربمہر لفافے کو کھول کر جس کو ابھی ابھی ڈاکیئے نے اس کے ہاتھ میں دے کر رسید حاصل کی تھی اپنی آنکھوں سے یہ پڑھا کہ اس کے باپ نے اس کی روز افزوں بدکاریوں سے تنگ آکر اس کو ایک دن بھی پہلے سے بہرہ نہ پاکر اپنی جائداد سے محروم کر دیا ہے اس کے دماغ پر ایک دھکا سا لگا مگر جب اس نے آنکھیں اُٹھا کر اس عورت کو جس کے استعمال کے لئے وہ اس دولت کو پیار کرتا تھا۔ اسی طرح مسرور اسی طرح مطمئن۔ اسی طرح اسے قصہ میں پایا تو وہ ایک بوڑھے شخص کے کمزور ارادے پر۔ ایک باپ کے بہت جلد فرو ہو جانے والے غصّہ پر ہنسا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔

ابھی اس کے پاس اپنی محنت سے کمائی ہوئی۔ اپنے مصارف سے بچا کر جمع کی ہوئی دولت تھی۔ اگرچہ وہ کئی بار یہ سمجھنے کی بے کار کوشش کرنا چاہتا تھا کہ یہ دولت بہت دیر تک اس کے موجودہ اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ابھی اس کو اس بات کی تسلی تھی کہ اس کا مایوس باپ اس کے لئے اس خوبصورت اور آراستہ مکان کے دروازے بند نہیں کر سکتا جس کو وہ ہمیشہ "میرا خوبصورت دفتر" کہہ کر پکارتا تھا اور جس کو اس نے اپنے

روپے سے اپنے نام بر خرید ا تھا اس کو بیوی کی موت دولت کے نقصان باپ کے غصے یہاں کی مایوسی کا کچھ احساس نہ ہوا کیونکہ وہ عورت حسن کی محبت سے بھری ہوئی ایک نظر میں وہ اپنے دل کے تمام جذبات کو مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اس پر مہربان تھی اس کے پہلو میں تھی اس کی تھی وہ دنیا کے تمام رشتوں کو تمام تعلقات کو تمام چیزوں کو صرف اسی ایک عورت کی وساطت سے محسوس کر سکتا تھا وہ عورت ایک رنگین چشمہ تھی۔ جس نے ممتاز کی نگاہ میں دنیا کی ہر چیز کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

(۱۲)

آخر ایک دن وہ بھی آیا جو قانون فطرت کے ہر گنہگار کے لئے موت سے زیادہ تلخی ہے جب اس کا تمام سرمایہ توقعات سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔ جب اس کے لئے اس کے "خوبصورت دفتر" کے دروازے اگر باپ کے غصے نے نہیں تو قرض خواہوں کی فوج نے بند کر دئے آہ! اس دن کو اگر آنا ہی تھا تو ذرا پہلے آیا ہوتا۔ جب ممتاز تندرست تھا۔ جب اس کا دماغ صحیح تھا۔ جب وہ کام کر کے دولت کمانے کی قابلیت رکھتا تھا مگر اس وقت وہ شہر کی سب سے زیادہ غریب سرور سرائے کے ایک تنگ و تار کمرے میں ایک شکستہ چارپائی پر لیٹا تھا۔

سراب لے جس کی کثرت اسی رقاصہ کی کوششوں کی مرہون منت احسان تھی۔ پانی۔ چاٹ۔ طعام اور ہر قسم کی خوراک کی جس کا وہ عادی تھا جگہ لے لی تھی۔ دحسرز نے ممتاز کو اپنی اداؤں کا اس قدر متوالا بنا دیا تھا کہ وہ پیاس بھوک۔ درد۔ غرض قوائے جسمانی کے ہر مطالبے کا علاج اسی کی عشوہ گریوں سے کرتا تھا اور اب جب کہ اس کے پاس اس جنس کے بغیر نہ ہاتھ آنے والے پانی کو خریدنے کے لئے جیب تک نہ تھا۔ اب جب کہ اعصابی تشنج کے درد انگیز دردوں کی شدت کو مٹانے کے لئے اس کو اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر وہ اردگرد کے منظر کو سمجھنے سے قاصر تھیں وہ رات کو اسی کمرے میں سویا تھا جس میں آج سے بارہ سال پہلے ایک رات کو وہ بے شمار امیدوں کو آغوش میں لئے داخل ہوا تھا۔ مگر آج صبح بیدار ہو کر اس نے آپ کو اس سرائے کے کمرے میں اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دیکھا اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی مگر جب اس کو اس خوب صورت رقاصہ کی وفا کا خیال آیا جس کے پاؤں کی ایک حرکت نے بارہ سال گزرے اس کی آیندہ زندگی کا دستور العمل تحریر کر دیا تھا۔ اور جو ابھی ابھی یعنی اس وقت جس وقت کی یاد اس کے مختل دماغ میں سب سے زیادہ محفوظ تھی اس کو پنکھا کر کر کے پیار سے بھری ہوئی تسلی دے دے

کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ یہ تمام درد و تکلیف، یہ تمام احتیاج و افلاس یہ تمام مایوسی و ذلت بھول گیا۔

اس نے کسی قدر حیرت، کسی قدر مسرت اور کسی قدر نفرت سے ایک سار لفافے کو دیکھا جو اس کے دائیں ہاتھ کے قریب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نمایاں جگہ پر رکھا تھا۔ حیرت اس لئے کہ آج اتنے طویل عرصہ کے بعد ایک خط کی موجودگی نے اس کو اس امر کا پتہ دیا کہ وہ اب تک اسی دنیا میں زندہ ہے جس کے رہنے والوں کے ساتھ اس کو کبھی تعلق تھا کیا کسی دل میں اس کی یاد اب تک باقی تھی کہ اس کا اظہار اس خاموش طریق سے کیا گیا تھا۔ مسرت اس لئے کہ شاید باپ نے بیٹے کی مصیبتوں کا حال سن کر اپنے فطری جذبے سے کام لیا ہے اور اس دولت کو جسے اس کے غصے نے چھین لیا تھا اس کی شفقت نے واپس کر دیا ہے۔ نفرت اس لئے کہ آہ یہ دولت اس وقت مل رہی ہے جب وہ اس کو استعمال کر کے حصول لذات کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لفافے کو اٹھایا۔ ہاتھوں سے زیادہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے کھولا اور انگلیوں سے زیادہ کانپتی ہوئی نظروں سے اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میں صرف دولت کو پیار کرتی ہوں۔ جب تک تمہارے پاس دولت تھی تمہاری تھی اور اب ان کی خاطر جن کے پاس دولت ہے تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑتی ہوں"۔

جو دماغ بیوی کی موت، باپ کی مایوسی، دولت کے نقصان سے نہ گھبرایا تھا۔ اس عورت کی دائمی جدائی کی خبر سن کر جس کی موجودگی میں دنیا بھر کی تکلیفیں راحتوں سے زیادہ دل پسند تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ آنکھیں کھول دیں اور ایک انتہائی اضطراب سے مضطرب ہو کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔

اس کی آنکھوں سے ایک ہولناک خواب کی جانکاہ کاوش ظاہر تھی۔ اس نے آنکھوں کو اور زیادہ کھول کر کلاک کو دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر پھر یاد دلایا "سرکار موٹر تیار ہے"۔

آہ! ان تین گھنٹوں کی غفلت میں اس نے کیا کیا دیکھ لیا کیا یہ سب کچھ ایک خواب تھا اس نے اپنے آرام دہ دیوان کو۔ اپنے دفتر کے آراستہ کمرے کو اپنے ملازم کی مودب یاد دہانی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دماغ پر زور دیا . . .

اور پھر کسی جائے نماز کی ضرورت کو محسوس کرنے کے بغیر کسی مسجد کو

تلاش کرنے کے بغیر اس نے اسی کمرے کے فرش پر گر کر سر سجود کو اس فیاض درگاہ پر جھکا دیا جس پر سر سجود خم کرنے والے کبھی ناامید نہیں رہتے اس کی آنکھوں سے شکریہ اور احسانمندی سے بھرے ہوئے دو بڑے بڑے آنسو نکلے۔ وہ اٹھا بہت سنجیدگی سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی لکڑی ہاتھ میں لی اور دروازے سے نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا جب موٹر ڈرائیور نے منتظر اور متجسس نگاہوں سے منزل مقصود کا پتہ دریافت کرنے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے صرف یہی کہا ——— "گھر چلو' جلدی بہت جلدی"

آج وہ پورے ایک مہینے کے بعد ایک افسردہ باپ' ایک مایوس بہن' ایک منتظر بیوی کے پاس جا رہا تھا وہ گھر میں داخل ہوا اس کی رفتار سے کچھ پریشانی اور بہت زیادہ خوشی ظاہر تھی۔ اندر جاتے ہی۔ اس نے اپنی بیوی کو جو شاید اس وقت بھی اسی کے انتظار میں بیدار اور اسی کی یاد میں اشکبار تھی سینہ سے لپٹا لیا۔ آنسو بہہ کر گناہ کے داغوں اور دل کے شکووں کو دھو رہے تھے۔